تذکرہ علمائے اہل حدیث

قسط نمبر ①

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے حضور میں

(بیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی)

جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)

۱۹۵۸ء میں جنرل ایوب خان نے ملک میں دستوری اور آئینی حکومت کا خاتمہ کر کے فوجی تسلط قائم کر دیا اور اس عمل کو ''انقلاب'' کا نام دیا۔ اس وقت راقم آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ میری شناسائی محلے کے ہم عمر عبیداللہ سے ہوگئی جو مستحکم ہو کر برادرانہ تعلقات پر اُستوار ہوئی۔ ان کی ترغیب پر میں نے محلّہ اسلام آباد (گوجرانوالہ) کی مسجد قدس میں جانا شروع کیا۔

ایوب خانی اِنقلاب سے ملک میں اور خود میری زندگی میں تو کوئی اِنقلاب نہیں آیا، لیکن عبیداللہ کی قربت اور رفاقت نے میری زندگی میں اِنقلاب کی ایک لہر پیدا کر دی اور میرا زیادہ وقت مسجد میں گزرنے لگا۔ میں نے اپنے طور پر نماز سیکھنا شروع کر دی اور باقاعدگی سے جلسوں میں جانے لگا جس سے مذہب کے ساتھ لگاؤ ہوا اور میرے علم میں وسعت پیدا ہونے لگی۔

کالج میں داخل ہونے کے بعد میں اپنے طور پر قرآن مجید پڑھنے کی مشق کرنے لگا اور بالآخر قرآن پڑھنے کے قابل ہو گیا، پھر اسی مسجد میں خادم کی حیثیت سے مسجد کی دیکھ بھال اور صفائی ستھرائی کا کام کرنے لگا۔ اس وقت یہ ایک چھوٹی سی مسجد تھی اور اس میں پانی کے لیے ایک ہودی بنی ہوئی تھی جس میں نلکا چلانے سے پانی بھرا جاتا تھا۔ میں اذان سے پہلے مسجد پہنچ جاتا اور نلکے سے ہودی کو پانی سے بھرتا جس سے نمازی وضو کرتے۔

۱۹۶۲ء میں مسجد قدس کی انجمن کا ایک وفد مولانا محمد اسماعیل سلفی کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ہر جمعہ نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن اِرشاد فرمانے کی اِلتماس کی جسے مولانا نے بخوشی منظور کر لیا۔

اس مقصد کے لیے میری ذمہ داری لگائی گئی کہ مولانا کو لینے کے لیے ان کے گھر جایا کروں۔ میں پیدل جاتا اور مولانا بھی میرے ساتھ پاپیادہ ہی چلے آتے۔ میں دستک دیتا، مولانا مجھے کمرے میں بلا لیتے۔ اس کمرے میں کتابیں سلیقے کے ساتھ الماریوں میں آراستہ تھیں۔ ان کے گردوپیش میں کتابیں کھلی ہوئیں دیکھتا اور انھیں مطالعے میں مصروف پاتا۔ مولانا چند منٹ میں کتابیں سمیٹ کر میرے ساتھ چل پڑتے۔ اس وقت میرا بنیادی علم محدود تھا اور میں مولانا کے مقام اور مرتبے کے پیشِ نظر ان سے گفتگو کی جسارت سے گریزاں رہتا۔

یہ سلسلہ سال بھر یوں ہی چلتا رہا۔ ایک روز مولانا نے میرا نام دریافت فرمایا، پوچھا: کون ہو؟ کیا کرتے ہو؟ میں نے اپنا نام بتایا اور کہا کہ حاجی فضل کریم کھوکھر (وفات: ۱۹۷۷ء) کا پوتا ہوں اور اسلامیہ کالج میں پڑھتا ہوں۔ پوچھا کہ اسماعیل کھوکھر (وفات: ۱۹۶۷ء) آپ کے کیا ہوتے ہیں؟ بتایا کہ میرے دادا کے چچا ہیں۔

۱۹۲۱ء میں گوجرانوالہ ایک مختصر سا شہر تھا اور اس کی آبادی ۳۷۸۸۷ نفوس پر مشتمل تھی۔ مسلمان ۲۳ ہزار سے زائد اور باقی ہندو اور سکھ تھے۔ اس وقت اہلِ حدیث کی صرف تین مساجد تھیں جن میں محلّہ حاجی پورہ کی مسجد کو مرکزی مقام حاصل تھا اور عرفِ عام میں اسے ''وہابیوں کی مسجد'' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ مسجد ''پہلوانوں والی مسجد'' کے نام سے بھی معروف تھی۔

مولانا علاء الدین رحمہ اللہ:

مولانا علاء الدین کا تعلق علی پور چٹھہ کے نزدیکی گاؤں ''پنڈوریاں'' سے تھا۔ وہ مولانا غلام رسول قلعوی رحمہ اللہ (وفات:

۱۸۷۴ء) کے حلقۂ درس ورُشد کے فیض یافتہ تھے۔ انھیں حضرت میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی (وفات: ۱۹۰۲ء) سے بھی شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ ۱۸۸۴ء میں مشن سکول گوجرانولہ میں مدرّس مقرر ہوئے۔ وہ تبلیغی واصلاحی جذبے سے سرشار تھے۔ انھوں نے چوک نیائیں کی مسجد کمہاراں میں خطیب اور امام کے طور پر دعوتی اور اِصلاحی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ یہ مسجد آج کل ''مسجد عائشہ'' کے نام سے موسوم ہے۔

اس وقت شہر جہالت، شرک وبدعت اور فرسودہ رسوم کی لپیٹ میں تھا۔ وعظ وتبلیغ میں حق گوئی اور راست گفتاری ان کا شعار تھا۔ انھوں نے اتباعِ سنت، اطاعتِ رسول اور عمل بالحدیث بلاتقلید کا علَم بلند کیا تو انھیں ''وہابی'' اور ''گستاخِ رسول'' قرار دے کر مسجد سے نکال دیا گیا۔

لیکن بے عملی، شرک وبدعت اور مخالفت کے طوفان کے باوجود ان کا حوصلہ کبھی متزلزل نہیں ہوا۔ مجبور ہو کر انھوں نے اُردو بازار میں ایک کھلی جگہ پر چند احباب کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے کا آغاز کر دیا۔ ممتاز محقق اور دانش وَر ڈاکٹر وحید قریشی (سابق پرنسپل اورینٹل کالج، لاہور۔ وفات: ۲۰۰۹ء) نے بتایا کہ اس جگہ پر بعد میں دکانیں تعمیر کر لی گئیں۔

آج کل اس مقام پر حافظ بک ڈپو اور دیگر ملحقہ دکانیں قائم ہیں، لیکن مخالفین اور مفسدین کی جانب سے بارہا نوبت یہاں تک آئی کہ مولانا ممدوح کو حالتِ امامت میں ہٹا دیا جاتا اور مزاحمت کرنے پر پولیس کی مدد بھی حاصل کر لی جاتی!

جامع مسجد اہلِ حدیث کی بنیاد:

مولانا ان نامساعد حالات سے افسردہ خاطر تھے، لیکن دل برداشتہ نہیں ہوئے۔ مولانا صاحب اور ان کے رُفقاء نے تبلیغی مقاصد کے لیے مسجد بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کے لیے ایک قلیل رقم جمع کر لی اور ایک قطعہ زمین خریدنے کی کوشش کی جو میاں امیر اور سائیں رنگ علی کے مشترکہ قبضے میں تھا۔ یہ زمین بے کار اور جاہل لوگوں کے تصرف میں تھی۔

۱۸۸۷ء میں سائیں رنگ علی سے زمین کے حصول کا معاہدہ طے پا گیا اور زمین کی نشان دہی کے بعد تعمیر کا کام شروع کر دیا گیا۔ لیکن مخالفین نے سائیں رنگ علی کو ورغلا کر یہ معاہدہ منسوخ کروا دیا اور یوں تعمیر میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ اس پر ان افراد نے میاں امیر سے رابطہ کیا جس نے معاہدے کی پاسداری کا یقین دلا دیا اور سائیں رنگ علی سے کہا کہ یہ زمین تو یہیں رہے گی۔ ہمیں اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اس پر ایک دو کمرے تیار ہو جائیں گے۔ اگر مسجد قائم رہی تو لوگ نماز پڑھیں گے، ورنہ کمرے ہمارے ہی کام آئیں گے۔

رفتہ رفتہ ایک چھوٹی سی مسجد معرضِ وجود میں آ گئی، لیکن مخالفین کے لیے مسجد کا قیام بے حد باعثِ آزار ہونے لگا۔ وہ ہر محاذ پر مشکلات پیدا کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔ مسجد کے قریب ہی ایک کنواں تھا جہاں سے وضو کے لیے پانی حاصل کیا جاتا تھا، فوری طور پر انھیں پانی لینے سے بھی روک دیا گیا جس پر حاجی پیر بخش کھوکھر اور پیر میر حیدر شاہ نے اپنی گرہ سے مسجد میں کنواں بنوا دیا۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس سے کہیں پہلے ہری پور ہزارہ سے تعلق رکھنے والے ایک مزدور عبدالواحد نے بھی اسی جگہ پر مسجد قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا۔ وہ موحد تھا، سائیں سے کہتا رہتا: ''مینوں وی جگہ دے تھوڑی جئی مسیت واسطے۔'' یعنی مجھے مسجد کے لیے تھوڑی سی جگہ دے دو۔

پیر میر حیدر شاہ مولانا غلام رسول رحمہ اللہ کی مجالست اور صحبت سے متاثر ہو کر شاہراہِ توحید پر گامزن ہو چکے تھے۔ انھوں نے حاجی پیر بخش کھوکھر (وفات: ۱۹۲۸ء) سے کہا کہ تم نے بہت سے پیر دیکھ رکھے ہیں، کبھی ہمارے پیر کو بھی آزما دیکھو۔ اس وقت دستور یہ تھا کہ پیر لوگ گلی محلوں میں اُڈے رہتے اور مریدوں سے نذرانے وصول کیے رہتے اور چھکڑوں میں بھر کر لیے جاتے۔

مولانا غلام رسول نے اپنی تبلیغی واصلاحی سرگرمیوں کا دائرہ گوجرانوالہ شہر سے کہیں آگے تک پھیلا رکھا تھا۔ پیر میر حیدر شاہ نے حاجی پیر بخش کھوکھر کی مولانا سے ملاقات کا اہتمام کیا۔ مولانا نے توحید وسنت کا درس دیا، انھیں وضو کرنے کی ہدایت کی اور اپنے ساتھ دو نفل ادا کرنے کا موقع دیا۔ مولانا نے یہ نفل اس جذب واستغراق اور

انہماک کے ساتھ ادا کیے کہ گردوپیش سے بے نیاز ہوگئے۔ یہ عمل ایسا تھا جس کے مشاہدے نے پیر بخش کی کایا ہی پلٹ دی۔ مولانا نے ان کا نام پیر بخش سے تبدیل کر کے پیر محمد کر دیا، مگر وہ ''پیر بخش'' ہی کے نام سے معروف رہے۔ حافظ آباد روڈ پر ایک بڑا باغ ان کی ملکیت میں تھا۔ اس جگہ پر اب آبادی حاجی پیر بخش ہے۔ جی ٹی روڈ پر جنرل بس سٹینڈ کے بالمقابل ایک وسیع رقبے کے بھی وہ مالک تھے۔

مولانا سلفی کی گوجرانوالہ آمد اور درسِ قرآن:

۱۹۲۱ء کے آغاز میں مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی (وفات: ۱۹۵۶ء) کی تحریک سے مولانا محمد اسماعیل کا تقرر محلّہ حاجی پورہ کی مسجد میں بطور مدرّس اور خطیب ہوا۔ ستمبر ۱۹۲۱ء میں چوک نیائیں کی مسجد علاء الدین کے خطیب مولانا علاء الدین کی وفات کا سانحہ پیش آ گیا جس کے ساتھ ہی مولانا سلفی کو اس مسجد میں خطابت اور درس و تدریس کے فرائض سونپ دیے گئے۔

مولانا سلفی نے یہاں آتے ہی نمازِ فجر کے بعد درسِ قرآن کا باقاعدہ آغاز کر دیا جس کی صورت یہ تھی کہ محرابِ مسجد پر مسند بچھا لیتے، تین اطراف میں تختے لگا دیے جاتے جن کے گرد شرکائے درس حلقہ باندھ لیتے اور ہر ایک کے سامنے تختے پر قرآنِ پاک رکھ دیا جاتا۔ مولانا چند آیات کی تلاوت اور ان کا ترجمہ کرتے اور حدیثِ رسول ﷺ کی روشنی میں قرآنِ پاک کی تفسیر بیان کرتے۔

رفتہ رفتہ درسِ قرآن میں شرکت کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ اس درس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ہندو اور سکھ بھی شامل ہونے لگے۔ درس کے دوران شرکائے درس کو سوال اُٹھانے کی اجازت تھی۔ مولانا نہایت متانت، سنجیدگی اور علم و دانش کے ساتھ جوابات دے کر سائلین کو مطمئن کرتے اور ان کے شکوک و شبہات رفع کرتے۔

مولانا کا درس زیادہ طویل نہیں ہوتا تھا۔ یہ اِلتزام تھا کہ روزانہ دو چار آیات ہی ترتیبِ قرآنی سے تلاوت کرتے۔ عام فہم اور دل نشین انداز میں اپنا زورِ بیان علم سے زیادہ عمل کی افادیت واضح کرنے میں صرف کرتے اور ذہن نشین کراتے کہ کامیابی کا حصول محنت و مشقت کے بغیر ممکن نہیں۔ وہ نجی محفلوں میں محنت و مشقت کی تلقین کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے تمام عمر محنت، مشقت اور بھاگ دوڑ میں گزار دی۔ ۱۹۴۰ء میں پہلی اور ۱۹۵۶ء میں دوسری مرتبہ درسِ قرآن کی تکمیل کی سعادت حاصل کی۔

مشکلات و مصائب:

مولانا کی رہائش گھنٹہ گھر کے قریب آبادی حاکم رائے میں تھی۔ مسجد تک جانے کے دو راستے تھے؛ ایک بازار برتنوں والے سے اور دوسرا چوک نیائیں سے ہوتا ہوا اُردو بازار کی طرف نکل جاتا۔ برتنوں والے بازار میں محمد شفیع کی دکان تھی جو شیدا پہلوان کا بھائی تھا۔ وہ قدآور، تنومند اور مضبوط جسم کا مالک تھا۔ مولانا مسجد میں جاتے ہوئے اس بازار سے گزرا کرتے تو یہ شخص بھی مولانا پر آوازے کستا اور انھیں وہابی کہہ کر اپنی نفرت و حقارت کا اِظہار کرتا۔

ایک دفعہ اس کے من میں کیا سمایا کہ مولانا کے تعاقب میں چلتا ہوا مسجد کے دروازے تک پہنچ گیا۔ مولانا کی نظر پڑی تو بلاتکلف اسے گلے لگا لیا اور تھام کر مسجد میں لے گئے۔ نماز کے بعد دوسرے افراد کے ساتھ وہ مولانا کی مجلس میں بیٹھ گیا۔ اسی مجلس میں ایک دیہاتی نے مولانا سے ایک مسئلہ دریافت کیا۔ مولانا نے حسبِ معمول مختصر جواب دیا جس سے وہ مطمئن نہ ہو سکا اور بولا کہ ہمارے حضرت صاحب نے یہ مسئلہ یوں بیان کیا ہے۔ مولانا نے اِنکساری سے کہا کہ حضرت صاحب مجھ سے کہیں بڑھ کر عالم ہیں، ان کے پاس علم ہے۔ میں نے اپنے علم کی حد تک جواب دے دیا ہے۔

مولانا کے اس عجز و انکسار نے محمد شفیع کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا۔ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور مولانا سے دعا کا خواستگار ہوا۔ مولانا کی توجہ فرمائی سے نظرِ عنایت کیا ہوئی کہ از خود رفتہ ہو گیا اور اتباع الرسول کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے ہی واپس ہوا۔

خطبۂ جمعہ کے دوران بجلی بند ہو جاتی تو فوراً ایک بہت بڑا دستی پنکھا

ہاتھوں میں تھام لیتا اور پوری قوت کے ساتھ نمازیوں کو ہوا دیتا، جب کہ خود پسینے سے شرابور ہوا جاتا۔ اس کارِ خیر میں حاجی شیخ محمد اسحاق فتح گڑھی بھی برابر کے شریک ہوا کرتے۔

مسجد کے قریب ہی گوجرانوالہ کے رئیس شیخ جھنڈو کی رہائش گلی شیخ جھنڈو میں تھی، اسی طرح شہر کے ایک اور رئیس حاجی پیر بخش کا گھر گلی حاجی پیر بخش میں تھا۔ یہ دونوں گلیاں برتنوں والے بازار میں کھلتی ہیں اور ابھی تک موجود ہیں۔ ان رؤساء کے اثر ورسوخ سے شر پسند عناصر اپنے مذموم عزائم میں ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شیخ جھنڈو کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ۱۸۸۷ء اور پھر ۱۹۳۵ء میں جامع مسجد کی بنیاد انھی کے ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اُن کا انتقال ۱۰ نومبر ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر سو سال سے زائد تھی۔ شیخ جھنڈو کا تعلق کشمیری برادری کی شیخ گوت سے تھا۔

علوم وفنون سے رغبت:

مولانا عربی، فارسی اور اُردو زبانوں پر مکمل عبور رکھتے تھے۔ ان زبانوں کی ادبی، لسانی، تہذیبی اور مذہبی روایت سے بھی خوب آشنا تھے، جب کہ ہندی اور سنسکرت سے اِستفادے کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔

انگریزی حروف کی پہچان از خود اور تعلیم ایک علم دوست رئیس سردار ٹھاکر سنگھ سے حاصل کی۔ انگریزی بخوبی پڑھ اور سمجھ سکتے تھے۔ ان کے مولانا سے قریبی اور خوشگوار تعلقات تھے۔ وہ مولانا کے علم وفضل کے قدردان اور مداح تھے اور ان سے ملاقات کے لیے اکثر آیا کرتے تھے۔ سردار ٹھاکر سنگھ اُردو بازار کے گردونواح میں ایک بڑی جائیداد کے مالک تھے۔ انھوں نے دیگاں والا بازار میں ٹھاکر سنگھ گیٹ کے قریب ہی اپنا پرنٹنگ پریس قائم کر رکھا تھا جہاں سے وہ اخبار ''سیوک'' نکالا کرتے تھے۔

۱۹۳۳ء میں مولانا نے ''سائیکلوسٹائل'' کا فن ماسٹر وزیر چند سے سیکھا۔ جلد ہی بڑی روانی کے ساتھ اس کے اِستعمال میں مہارت حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ سائیکلوسٹائل کو فوٹو سٹیٹ (عکسی نقول) کی اِبتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے استعمال سے ایک تحریر کو بار بار دستی نقل کرنے کی زحمت سے نجات ہو جاتی تھی۔ مولانا دیگر مقامات سے رابطے میں رہنے کے لیے اس فن کی افادیت سے بخوبی آ گہی رکھتے تھے۔

مولانا کے والد محترم مولانا محمد ابراہیم (وفات: ۱۹۴۲ء) ایک مشاق اور کہنہ مشق خطاط تھے۔ خطاطی کی مشق انھی کی نگرانی میں کرتے رہے جس کا مفاد یہ ہوا کہ صاف، شفاف، روشن اور جاذبِ نظر تحریر اِملا کرنے کے وصف سے بہرہ وَر ہو گئے۔

حکمت کی تعلیم امرتسر میں مولانا محمد عالم آسی (وفات: ۱۹۴۴ء) سے حاصل کی۔ انھوں نے اپنی مسندِ درس وتدریس مسجد خیر الدین میں بچھا رکھی تھی۔ مولانا آسی کا تعلق بریلوی مسلک سے تھا۔ وہ وسیع المطالعہ اور وسیع الظرف تھے۔ جملہ علوم وفنون میں غیر معمولی دسترس اور حکمت میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے۔ مولانا سلفی نے حکمت کی ابتدائی وانتہائی کتابیں انھی سے پڑھیں۔

مولانا سلفی نے کتابت وحکمت میں کمال تو حاصل کیا، مگر ان فنون پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ اپنی تمام تر توانائی اسلامی علومِ عالیہ، خصوصاً حدیث شریف کی نشر واشاعت اور تدریس وتوضیح پر مذکور کیے رکھی۔

کتاب دوستی:

کتب بینی اور کتب اندوزی کا عمدہ ذوق رکھتے تھے۔ کتاب شناس اور کتاب دوست تھے۔ ان کے مطالعے کی وسعت کا یہ عالَم تھا کہ ملنے والے ان کی گفتگو سے حیرت میں ڈوب جاتے۔ کتابوں کو اہتمام کے ساتھ دھوپ دکھاتے۔ نمی کے اثرات سے بچانے کے لیے الماریوں کو دیوار سے دوری پر رکھتے۔ الٹا پلٹا کر اسی ترتیب سے جما دیتے۔ مولانا نے علمائے متقدمین امام ابن تیمیہ، امام ابن قیم اور حافظ ابن حجر رحمہ اللہ کی تصانیف کا خاصا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا۔ طلبہ کو افکارِ ابن تیمیہ کے مطالعے کی جانب رغبت دلائے رہتے۔

متاخرین میں والا جاہ نواب سید محمد صدیق حسن خان رحمہ اللہ (وفات:۱۸۳۲ء)، شاہ ولی اللہ (وفات:۱۷۶۳ء) اور مولانا ابوالکلام آزاد (وفات: ۱۹۵۸ء) کی کتابوں کا اکثر حصہ ان کے پاس موجود تھا۔ مولانا آزاد کی تفسیر ''ترجمان القرآن'' جب شایع ہوئی اور اپنے دستخطوں سے جن احباب کو اولیں فرصت میں بھجوائی، ان میں مولانا سلفی بھی شامل تھے۔ مولانا آزاد دیگر علمی اور سیاسی مصروفیات کی بنا پر اس تفسیر کو مکمل نہ کر سکے اور یہ کام سورۃ المومنون تک پہنچ کر رُک گیا۔

سورت کہف میں جس مقام پر ذوالقرنین کا قصہ مذکور ہے، ''ترجمان القرآن'' کی اولین اشاعت میں اس کے بالمقابل ذوالقرنین کی تصویر چسپاں کی۔ یہ تصویر مولانا نے ایران میں نصب مجسمے سے بنوائی تھی۔ مولانا سلفی کی نظر سے جب یہ تصویر گزری تو اس فروگزاشت کی جانب متوجہ کیا۔ مولانائے آزاد نے فی الفور ''ترجمان القرآن'' کی فروخت بند کر دی اور بقیہ تمام نسخوں کو اس تصویر سے معریٰ کر دیا۔

کتابوں کے علاوہ رسالوں کی جمع آوری پر بھی کمر بستہ رہتے۔ علامہ رشید رضا مصری رحمہ اللہ نے اپنا ماہ نامہ ''المنار'' ان کے نام اِعزازی طور پر جاری کر رکھا تھا۔ مولانا ابوالکلام کا ''الہلال'' تسلسل کے ساتھ موصول ہوتا اور اس کا فائل دیدہ زیب جلد بندی کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا۔

جمعہ مبارک کا خطبہ:

مولانا کا خطبہ جمعہ مبارک اس قدر موثر ثابت ہوا کہ شہر کے مختلف حصوں سے بھی کافی تعداد میں لوگ شریک ہونے لگے۔ اس وقت اہلِ شہر توحید وسنت سے ناآشنا تھے اور ہر طرف شرک وبدعت، بے دینی اور غیر اسلامی رسومات کا دور دورہ تھا اور پیری مریدی کا دھندہ زوروں پر تھا۔ مولانا کی تبلیغی اور اصلاحی مساعی سے شہر کی فضا میں خوش گوار تبدیلی رونما ہونے لگی جس سے اہلِ شرک وبدعت کے مفادات پر زد پڑی اور ان کے تیور بگڑنے لگے۔

مجھے ۱۹۶۱ء میں پہلی مرتبہ جمعہ مبارک کے خطبے میں شمولیت کا اِعزاز حاصل ہوا۔ اس کے بعد بارہا مولانا کے خطبات سے مستفید ہونے کے مواقع ہاتھ آتے رہے۔ مولانا کا معمول تھا کہ گھنٹہ بھر پہلے ہی مسجد میں آموجود ہوتے۔ پانی، صفائی، طہارت خانوں اور صفوں کا جائزہ لیتے۔ کہیں کہیں صفوں اور دریوں کو درست کر دیتے۔ اس کے بعد قرآن مجید لے کر دو تین صفوں کی دوری پر محراب کی دائیں جانب تشریف فرما ہو جاتے اور تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ آدھے گھنٹے میں مسجد کا ہال بھر جاتا۔

خطبہ مسنونہ کے بعد چند آیات پڑھتے اور کسی ایک موضوع پر خطاب کا آغاز کر دیتے۔ آسان اور عام فہم اُردو آمیز پنجابی میں احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں ایک نقطۂ نظر کی بنیاد رکھتے۔ آخر میں اپنے موقف کی تائید میں مختلف آیات پیش کرتے۔ پوری توجہ زیرِ گفتگو موضوع تک ہی مرکوز کیے رہتے۔

خطاب میں سیاسی نشیب وفراز کو سلیقے کے ساتھ مربوط رکھنے کے ہنر میں ان سے بڑھ کر اور کون آشنا ہوگا! سامعین کو حالاتِ حاضرہ اور سیاسی معاملات پر غور وفکر کا وافر سامان مہیا ہو جاتا۔

مولانا قرآن وحدیث کے ترجمان تھے، لیکن ہر کوئی یہی سمجھتا کہ مولانا اسی کے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں۔ انھیں کسی بھی موضوع پر نئے انداز اور پہلو سے علمی گفتگو کی قدرت حاصل تھی۔ مولانا کے ارشاداتِ عالیہ سے استفادے کے لیے عوام ہی نہیں، اربابِ علم وادب اور سیاسی کارکنوں کی ایک تعداد بھی شامل ہوتی۔

خطبے کے بعد مسجد کے صحن میں ان حضرات کی ایک مجلسِ علمی برپا ہوتی۔ اس مجلس کے روحِ رواں میاں اسماعیل ضیاء (وفات:۱۹۹۷ء) تھے۔ سعید بھٹی، کامریڈ بشیر، صاحبزادہ ضیغم البھاکری اور کبھی کبھار ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر یوسف گورایہ، الطاف گوہر (وفات: ۲۰۰۰ء) اور مولانا مسعود عالم ندوی (وفات:۱۹۵۴ء) بھی شریکِ محفل ہوتے۔ مولانا ندوی کا گوجرانوالہ آنا جانا لگا رہتا تھا۔ ان کی بیٹی پروفیسر

عبدالحمید صدیقی (ایڈیٹر ''ترجمان القرآن''۔ وفات: ۱۹۷۸ء) کے عقد میں تھی۔ وہ کہا کرتے: ''مولانا کیسی پنجابی بولتے ہیں کہ ہم جیسے اہلِ زبان پوری طرح سمجھ جاتے ہیں!'' یہ بھی کہتے: ''مولانا کی خطابت سے معلوم ہوتا ہے کہ پنجابی میں بھی علمی گفتگو کی جاسکتی ہے۔''

مدرسہ محمدیہ کا قیام:

مدرسہ محمدیہ اپریل 1915ء میں مسجد کی عمارت ہی میں قائم کیا گیا۔ جب طلبہ کی تعداد میں اِضافہ ہونے لگا تو مدرسے کے لیے ایک الگ عمارت بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے جنوری ۱۹۲۴ء میں حاجی پیر بخش نے حافظ آباد روڈ پر دو کنال اراضی اور ایک ہزار روپے کی رقم فراہم کی۔ اس سلسلے میں ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر) کے شمارے (۲۸ مارچ ۱۹۲۴ء) میں شایع ہونے والی یہ تحریر پیشِ خدمت ہے:

''عنقریب مدرسے کے واسطے ایک عمارت بنانے کا اِرادہ ہے جس کے لیے جناب حاجی پیر محمد رئیس نے دو کنال اراضی اور ایک ہزار روپیہ نقد مرحمت فرمایا ہے۔''

اس وقت یہ جگہ چونکہ شہر کی حدود سے باہر تھی، اس لیے اسے عیدگاہ کے طور پر اِستعمال کیا جانے لگا۔ لیکن بعض وجوہات کی بنا پر اس مقام پر مدرسے کی عمارت تعمیر نہ ہوسکی۔ رفتہ رفتہ یہ جگہ شہر کی حدود سے ملحق ہوتی چلی گئی۔ ۱۹۶۵ء میں حاجی پیر بخش کھوکھر کے ایک پوتے بابو عبدالرحیم کھوکھر علیگ (وفات: ۱۹۸۹ء) نے یہاں پیر بخش ماڈل ہائی سکول قائم کردیا جو اب ''پی بی ماڈل ہائی سکول'' کے نام سے معروف ہے۔

انجمن تبلیغ الاسلام اہلِ حدیث گوجرانوالہ:

مولانا نے دعوت وتبلیغ اور مسلک اہلِ حدیث کے تعارف کے لیے انجمن تبلیغ الاسلام اہلِ حدیث کی بنیاد رکھی اور نواحی دیہات کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز ومحور بنایا۔ اس سلسلے میں حافظ محمد محدث گوندلوی (وفات: ۱۹۸۵ء)، مولانا نور حسین گرجاکھی (وفات: ۱۹۵۱ء)، مولانا احمد دین گکھڑوی (وفات: ۱۹۷۳ء) رحمہم اللہ اور دیگر علماء کی معاونت حاصل رہی۔ تمام مبلغین سفر کے اخراجات اپنی گرہ سے از خود ادا کرتے تھے۔

۲۷ مارچ ۱۹۲۵ء کو تلونڈی کھجوروالی میں قادیانی جماعت کا جلسہ تھا اور انھوں نے مناظرے کا چیلنج بھی دے رکھا تھا۔ مولانا کی قیادت میں علماء کا ایک وفد وہاں گیا، مخالف فریق کنی کترا گیا اور مباحثہ نہ ہوسکا۔ مولانا احمد دین گکھڑوی نے تقریر کی جس کا اچھا اثر ہوا۔ مولانا نور حسین گرجاکھی نے عیسائیوں سے دو دن تک مباحثہ کیا۔ دو عیسائی مسلمان ہوئے، خود پادری نے بھی مولانا نور حسین کے ضبطِ انجیل کی برملا تعریف کی۔

مولانا ثناء اللہ امرتسری (وفات: ۱۹۴۸ء) نے ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر) میں انجمن کی سرگرمیوں کی تحسین وتوصیف مندرجہ ذیل الفاظ میں کی:

''اس میں شک نہیں کہ جماعت اہلِ حدیث ضلع گوجرانوالہ اپنی بساط کے مطابق کام کررہی ہے۔ اسی طرح اگر دوسرے مقامات کی جماعتیں بھی کام کریں تو بہت فائدہ ہوگا۔''

۲ نومبر ۱۹۲۳ء کو اس انجمن کے اہتمام سے ''نت کلاں'' میں مولانا کی تقریر ہوئی اور ان کی ترغیب سے ''انجمن اہلِ حدیث نت'' کا قیام عمل میں آیا۔

ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر) سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۷، ۱۸ نومبر ۱۹۲۳ء کو وزیر آباد میں دو روزہ جلسہ منعقد ہوا جس میں مولانا محمد جوناگڑھی (وفات: ۱۹۴۱ء) اور دیگر علماء کے علاوہ مولانا سلفی نے بھی خطاب کیا۔ دوسرے روز مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریر کی اور انھوں نے آریہ سماج اور شدھی کے مسئلے پر فاضلانہ اور محققانہ نکات پیش کیے۔

۲۸ دسمبر ۱۹۲۳ء کو سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے اِشتراک سے انجمن تبلیغ اہلِ حدیث کی تجدیدِ نو ہوئی۔ اس سے انجمن کی تبلیغی سرگرمیوں کی ضلع سیالکوٹ تک وسعت پیدا ہوگئی۔ (جاری ہے)

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے حضور میں

(بیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی)

جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)

اسفار:

تبلیغ و تنظیم سازی کے لیے سفر پر نکلنا از بس ضروری ہے۔ سفر کتنا ہی پُرسکون اور پُر آسائش کیوں نہ ہو، پھر بھی اس راہ میں صعوبت اور تکلیف کا سامنا رہتا ہی ہے۔ مولانا نے گوجرانوالہ کو مرکز بنا کر اپنی سرگرمیوں کو مقامی حد تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ دعوت و تبلیغ اور رابطے کے لیے گرد و نواح کے علاوہ دور دراز مقامات تک کا سفر بھی کیا۔ مسلک اہلِ حدیث کو عوام سے متعارف کرانے کے لیے انھیں سفر کے سخت اور دشوار مراحل سے گزرنا پڑا۔ اس وقت راستوں اور سڑکوں کی حالت اس قدر ابتر تھی جس کی تصویر کشی ممکن نہیں۔ سڑکیں اور راستے ناہموار اور ناپختہ تھے۔ مٹی کے اوپر کہیں کہیں اینٹیں جما دی جاتی تھیں جو جلد ہی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتیں۔ سڑکوں پر جا بجا گڑھے ہوتے جو برسات میں جوہڑ بن جاتے۔ سفر کے لیے زیادہ تر تانگوں ہی پر انحصار کرنا پڑتا تھا، بسوں کی تعداد بھی کچھ زیادہ نہیں تھی اور مجبوری کے عالم میں پاپیادہ سفر طے کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

سفر کس قدر کٹھن اور غیر محفوظ تھے، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل تحریر سے لگایا جا سکتا ہے:

۱۶ فروری ۱۹۳۳ء: مولانا محی الدین قصوری (وفات: ۱۹۷۱ء) سے ملاقات کے لیے لاہور گئے۔ واپسی پر بس کالا شاہ کاکو کے قریب اُلٹ گئی، مولانا محفوظ رہے، بال بال بچ گئے۔

۱۲ مارچ ۱۹۳۳ء: ملک لال خان (وفات: ۱۹۷۶ء) سے ملاقات کے لیے نوشہرہ ورکاں گئے۔ ملک صاحب وہاں نظر بند تھے۔ واپسی پر ''بڈھا گورایہ'' سے سواری نہ مل سکی۔ مولانا نے چھ میل کی یہ طویل مسافت پیدل طے کی۔ راستے میں بارش کا بھی سامنا کرنا پڑا۔

۲۷ فروری ۱۹۵۵ء: جلسہ گوندلانوالہ کے لیے گوجرانوالہ سے چلے، راستے میں تانگہ ٹوٹ گیا، مگر کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔

۲۲ فروری ۱۹۵۶ء: صبح اکال گڑھ میں خطاب کے بعد جلسے میں شرکت کے لیے میرپور جا رہے تھے تو تانگہ ایک فوجی ٹرک سے ٹکرا گیا۔ حادثہ اگرچہ خطرناک تھا، مگر کوئی چوٹ نہیں آئی۔

دورۂ مشرقی پاکستان:

یکم اپریل ۱۹۶۴ء کو مولانا بذریعہ طیارہ ڈھاکہ پہنچے۔ حاجی محمد اسحاق حنیف مرحوم ان کے ہم سفر تھے۔ ۳/اپریل کو جمعیت اہلِ حدیث ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت کی۔ اجلاس کا پنڈال آموں کے باغ میں لگایا گیا تھا۔ مولانا نے خطبۂ جمعہ اُردو میں اِرشاد فرمایا جس کا ساتھ ہی ساتھ بنگلہ ترجمہ سنایا گیا۔ اس کے بعد راجشاہی سے ہوتے ہوئے ۴/اپریل کو نواب گنج پہنچے اور وہاں کے نواحی قصبے حسائی میں اہلِ حدیث کانفرنس میں شرکت کی۔ مولانا نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا۔ انھوں نے افتتاحی خطبہ لکھ کر منتظمین کو پہلے ہی بھجوا دیا تھا جس کا بنگلہ ترجمہ شایع کر کے خطبے کے موقع پر سامعین میں تقسیم کر دیا گیا۔ اس کے بعد معروف محقق ڈاکٹر عبدالباری نے غیر مطبوع خطبہ صدارت فی البدیہہ پڑھا۔ یہ نواب گنج کا نواحی قصبہ ہے جس کی غالب آبادی اہلِ حدیث حضرات پر مشتمل ہے۔

انجمن اِسلامیہ گوجرانوالہ:

تعلیمی مقاصد کے لیے اس انجمن کی بنیاد ۱۸۹۲ء میں رکھی گئی تھی۔ مختلف اوقات میں منعقد ہونے والے جلسوں میں مولانا برابر شرکت کرتے رہے۔ ۷ مارچ ۱۹۳۳ء کے اجلاس میں فراہمیِ چندہ کے لیے مولانا نے مختصر تقریر کی، اس موقع پر کافی رقم جمع ہوگئی۔ یہ انجمن ابھی تک قائم ہے، لیکن غیر فعال ہوچکی ہے۔ اس کے تحت چلنے والے اِداروں کو بھٹو حکومت نے سرکاری تحویل میں لے لیا اور اثاثوں پر قبضہ جمالیا جس سے انجمن مفلوج ہو کر رہ گئی۔

تقسیم ہند کے وقت خالصہ کالج کے پرنسپل ''باوا ہرکشن سنگھ'' اور ہندو ڈپٹی کمشنر ''سندر داس میدھا'' کی ملی بھگت سے حکومتِ پنجاب نے کالج انتظامیہ کو کالج کا تمام فرنیچر، لائبریری، لیبارٹری اور آفس ریکارڈ امرتسر منتقل کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ قیمتی ساز وسامان ٹرکوں میں لادلیا گیا، عزیز ذوالفقار مرحوم نے ایک ملاقات میں بتایا کہ اطلاع ملنے پر مولانا سلفی نے عبدالرحیم کھوکھر ایم ایس سی علیگ کی سرکردگی میں ڈیڑھ سو رضا کاروں کا ایک دستہ روانہ کیا جس نے لاہوری چُنگی کے قریب ان ٹرکوں کو روک لیا اور سامان کو ''محبوب عالم ہائی سکول'' منتقل کردیا۔ اس کے ساتھ ہی انجمن اسلامیہ نے خالصہ کالج کو اپنی تولیت میں لے لیا۔ سائنس کے تمام اساتذہ کا تعلق ہندو اور سکھ برادری سے تھا جو شہر چھوڑ کر نکل گئے۔ کھوکھر صاحب نے طلبہ کو سائنس پڑھانے کی ذمہ داری اِعزازی طور پر لیے رکھی۔

اندازِ تدریس:

مولانا سلفی اعلیٰ پایے کے خطیب، ادیب، مصنف اور معلّم تھے۔ تمام عمر علومِ اسلامیہ کی تدریس میں مصروف رہے۔ تفسیرِ قرآن، علمِ کلام، منطق، فلسفہ اور عربی ادب میں یکساں مہارت رکھتے تھے، تاہم ان کا دل پسند اور مرغوبِ طبع مضمون بہر طور علمِ حدیث ہی تھا۔ انھوں نے طلبہ میں حدیث کی اہمیت، حجیت، عمل بالحدیث اور اسماء الرجال کی اہمیت جاگزیں کی اور ان کے ذوقِ سلیم کی نشو ونما فرمائی۔ کتبِ حدیث میں بخاری، ابوداود اور ترمذی سبقاً سبقاً پڑھاتے رہے۔

ان کی کنیت ''ابوالخیر'' تھی۔ اِبتدا میں اپنے نام کے ساتھ ''ذبیح'' کا لقب اور پھر ''محمدی'' کی نسبت پسند فرمائی۔ ۱۹۵۵ء میں جامعہ سلفیہ کی تاسیس کے بعد ''سلفی'' کی نسبت اِختیار کرلی۔

وہ تعلیمی میدان کے شہسوار تھے۔ ان کی تدریس کا انداز منفرد، موثر اور دل نشیں تھا اور طلبہ کو پیچیدہ نکات ومباحث آسانی کے ساتھ سمجھانے کا فن انھیں خوب آتا تھا۔ علومِ حدیث میں ان کے اعلیٰ مقام ومرتبے کے اِعتراف میں انھیں ''شیخ الحدیث'' کے لقب سے شہرت حاصل ہوئی اور یہ ان کی پہچان بن گیا۔

خدماتِ حدیث کے ضمن میں امام بخاری رحمہ اللہ کی مساعیِ جمیلہ کے وہ بڑے معترف تھے۔ اکثر وبیشتر احسن انداز میں امام بخاری رحمہ اللہ کی مساعی کو طلبہ کے ذہن میں سموتے۔ مولانا نے جمع وتدوینِ حدیث میں امام بخاری رحمہ اللہ کے بے مثل کردار کو اُجاگر کرنے کے لیے پندرہ روزہ الہدیٰ (دربھنگہ، بھارت) میں ایک تحقیقی مقالہ لکھا جو بعد میں ''امام بخاری کا مسلک'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شایع ہوگیا۔

حدیثِ رسول کو دینِ اسلام کا بنیادی ماخذ قرار دیتے تھے۔ اس نظریے کی تائید اور دفاع میں ''حجیتِ حدیث''، ''احکامِ شریعت میں حدیث کا مقام''، ''جماعت اِسلامی کا نظریۂ حدیث''، ''حدیث کی تشریعی اہمیت''، ''سنت قرآن کے آئینے میں'' وغیرہ ان کی تحریر فرمودہ تصانیف معروف ہیں۔ انھوں نے مشکاۃ المصابیح کا اُردو ترجمہ بھی کیا۔ مولانا نے دیگر موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی، مگر علومِ حدیث موضوع پر ان کا قلم خوب چلتا۔ قلم برداشتہ لکھتے اور کاٹ چھانٹ سے بے نیاز تھے۔

اِسلامی قانون کی تدوین میں فکری جمود کو ایک بڑی رکاوٹ خیال کرتے۔ وہ آزادیِ غور وفکر پر قدغن کو سخت مضر رساں سمجھتے۔ ''تحریک آزادیِ فکر اور حضرت شاہ ولی اللہ کی تجدیدی مساعی'' میں انھوں نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ مولانا سلفی کا موقف تھا یہ شاہ ولی اللہ ہی تھے کہ جن کی تعلیمات کی بدولت برصغیر میں حدیث کو دین کے

بنیادی ماخذ کی حیثیت سے قبول کرنے کی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ طلبہ کے پاس تدریس کو جاتے تو کچھ برفی بھی ساتھ لیے جاتے اور ان میں تقسیم کر دیتے۔ دورانِ تدریس اس طرح گھل مل جاتے کہ انھیں کسی قسم کا خوف نہ رہتا۔ طلبہ کے کردار اور تہذیب واخلاق پر خصوصی نظر رکھتے اور اخلاقی گراوٹ برداشت نہ کرتے۔ طلبہ سے کوئی سوال دریافت کرتے اور فرماتے کہ جو اس کا صحیح جواب دے گا، اس کو پانچ روپے کی برفی ملے گی۔ مولانا محمد حنیف ندوی رحمہ اللہ (وفات: ۱۹۸۷ء) فرماتے ہیں کہ اِنعام کی اس برفی کا وافر حصہ اکثر میرے ہی حصے میں آتا رہا۔

مساجد کا قیام:

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا نے مسجد میں آنے والے افراد کو تلقین کی کہ دُور سے آنے والے حضرات اپنے محلے کی مسجد ہی میں نماز ادا کریں۔ اگر ان کے قرب وجوار میں اہلِ حدیث مسجد نہیں ہے تو وہاں مسجد قائم کریں اور جماعت کی تنظیم کریں۔ مولانا کے اس طرزِ عمل اور حکمتِ عملی سے سے شہر بھر میں اہلِ حدیث مساجد تیزی سے تعمیر ہونے لگیں۔ یاد رہے کہ تقسیمِ ہند کے وقت گوجرانوالہ میں اہلِ حدیث مساجد کی تعداد صرف پانچ تھی اور ۱۹۶۸ء میں ان کی وفات پر شہر میں پچاس سے زائد مساجد قائم ہو چکی تھیں!

مولانا سلفی رحمہ اللہ کا یہ اِرشاد تھا کہ مسجد کی تعمیر کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جو دوسرے مسالک کی مساجد سے مناسب فاصلے پر ہو۔ ایک دفعہ اہلِ محلّہ بختے والا نے مسجد کی تعمیر کے لیے ایک ایسی جگہ کا سودا کر لیا جو ایک بریلوی مسجد سے زیادہ دُوری پر نہیں تھی۔ بریلوی حضرات نے مسجد کی تعمیر میں رکاوٹ کھڑی کر دی جس سے معاملہ تنازع کی صورت اِختیار کر گیا اور تصفیے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ اس مرحلے پر بریلوی حضرات نے اپنے حمایتیوں کو جمع کر کے پیر فیض الحسن شاہ صاحب (وفات: ۱۹۸۴ء) کو بلا لیا۔ مولانا سلفی اپنے احباب کی معیت میں اس مجلس میں پہنچ گئے۔ جوں ہی پیر صاحب کی نظر مولانا سلفی پر پڑی تو وہ بہت تیزی سے کھڑے ہوئے اور مولانا سے بغل گیر ہو گئے اور اِعلان کر دیا کہ اس مسئلے کا تصفیہ مولانا اسماعیل سلفی ہی کریں گے اور ان کا ہر فیصلہ ہمارے لیے قابلِ قبول ہو گا جس کے ساتھ ہی مجمع چھٹ گیا۔ بعد میں مولانا موقع پر تشریف لے گئے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ دیا کہ مجوزہ مسجد دوسری مسجد سے مناسب فاصلے پر نہیں، اس لیے اس مقام پر مسجد تعمیر نہیں کی جائے گی، چنانچہ مسجد اہلِ حدیث کے لیے دوسری جگہ کا اِنتخاب کیا گیا۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ گوجرانوالہ میں مساجد کی تعمیر میں ہمہ تن متحرک رہے جس سے شہر کے کونے کونے میں مساجد کا ایک جال بچھ گیا، لیکن بایں ہمہ دیگر شہروں میں مساجد کی تعمیر سے بھی کبھی غافل نہیں رہے۔ اُن مقامات پر مساجد کے قیام پر خصوصی توجہ مبذول کیے رکھی جہاں اہلِ حدیث مساجد کا وجود نہیں تھا۔ ایسے بے شمار مقامات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جہاں ان کے رابطوں، دوروں اور کوششوں کے نتیجے میں مساجد کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔ مولانا نے ان کی مالی معاونت کی اور وسائل مہیا کیے۔

پاکستان بھر کے مختلف مقامات سے لوگ مساجد کے سلسلے میں درپیش مشکلات اور مسائل لے کر آتے۔ مولانا انھیں ثابت قدمی کی تلقین کرتے اور مناسب ہدایات دیتے۔ مالی معاونت کے لیے آنے والے نمائندوں اور سفیروں کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ اور مشفقانہ ہوتا۔ ان کی ذاتی ضروریات کا خیال رکھتے۔ مولانا نے انتظامیہ کو یہ ہدایت جاری کر رکھی تھی کہ ان حضرات کو مہمان تصور کیا جائے اور ان کی تکریم اور مہمان نوازی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ برتی جائے۔ ان کے لیے شب گزاری اور خورونوش کا مناسب بندوبست رکھا جائے۔

کئی بار ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ بذاتِ خود بازاروں اور مارکیٹوں میں چلے جاتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا محمد یونس اثری (وفات: ۲۰۰۴ء) کے ساتھ بازار میں نکلے ہوئے ہیں اور جامع مسجد اہلِ حدیث (مظفر آباد، آزاد کشمیر) کے لیے صاحبِ ثروت اور مخیّر

حضرات سے رابطہ کر رہے ہیں۔ دار العلوم (غواڑی بلتستان) سے مولانا عبدالباقی بھی مالی معاونت کے سلسلے میں گوجرانوالہ آتے، مولانا سلفی مصروفیات کے باوجود ان کے ہمراہ فراہمیِ چندہ کے لیے چل پڑتے۔

چکوال میں اہلِ حدیث کی اولیں مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مولانا کی خدمات ناقابلِ فراموش رہیں گی۔ اس مسجد کا افتتاح مولانا نے ۱۹۶۶ء میں اپنے دستِ مبارک سے کیا۔ مذکورہ مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مخالفین نے شدید رکاوٹ ڈالے رکھی۔ رسول نگر میں مسجد اہلِ حدیث کی تعمیر چھت ڈالنے کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی کہ شیعوں نے چھت کی تعمیر میں رکاوٹ ڈال دی۔ مولانا نے گوجرانوالہ کے با اثر شیعوں سے مل کر اس کی تعمیر مکمل کروائی۔ اس مقصد کے لیے حاجی عبدالحق ناگی (وفات: ۲۰۰۶ء) کو رقعہ دے کر رسول نگر روانہ کیا۔ دورانِ سفر حاجی صاحب مسجد کی تعمیر میں حائل رکاوٹ کے خاتمے کے لیے جس دل جمعی اور خشوع وخضوع کے ساتھ محوِ دعا رہے، اس کی لطافت سے میرا دل ودماغ ابھی تک شاد ہے۔

اخلاقِ عالیہ اور اس کے اثرات:

مولانا کا معمول تھا کہ اذان سے نصف گھنٹہ پہلے مسجد کا رُخ کرتے۔ بازار سے گزرتے تو ابتدا میں راستے میں لوگ ان پر آوازے کستے، ان پر تذلیل وتوہین کے تیر برساتے اور وہابی کہہ کر پکارتے۔ مولانا خاموشی اور تحمل کے ساتھ چلتے جاتے اور تمسخر اُڑانے والوں کو خندہ پیشانی کے ساتھ سلام کہتے جاتے۔ رفتہ رفتہ مولانا کے حسنِ سلوک، قوتِ برداشت اور جذبۂ درگزر سے مولانا کے قدردانوں کا حلقہ وسیع ہونے لگا، نمازیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا اور مسجد کی وسعت کی ضرورت پیش آ گئی، چنانچہ ۱۹۳۵ء میں ملحقہ زمین کا ٹکڑا خرید کر مسجد کی توسیع اور تعمیرِ نو کی گئی۔

مسجد کے قریبی چوک میں نذیر بھٹے والے کی دکان تھی۔ یہاں پر شوکت عرف ککو پہلوان اور دیگر زبان دراز بھی بیٹھا کرتے تھے۔ مولانا جب ان کے پاس سے گزرتے تو یہ لوگ بھی ان کا مذاق اُڑاتے اور تضحیک وتذلیل کا نشانہ بناتے۔ مولانا حال احوال پوچھتے اور سلام دعا کہتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے۔ ایک بار جو دیکھا تو ککو پہلوان کو وہاں موجود نہیں پایا، مولانا نے قدرِ توقف فرمایا اور عنایت سے پوچھا: ''ککو کہاں ہے؟ خیریت سے تو ہے؟'' بتایا: گھر میں بھینس دھونے گیا ہوا ہے۔ مولانا وہیں سے سیدھے گلی حاجی پیر بخش میں ککو کے گھر چلے گئے، دیکھا تو بھینس کا دودھ دوہ رہا ہے۔ مولانا نے اُس کی خیریت دریافت کی۔ وہ مولانا کو دیکھ کر حیرت واستعجاب کی تصویر بن گیا اور سر جھکا کر مودّب ہو گیا۔ اپنے رویے پر ندامت کا اِظہار کیا اور عہد کیا کہ آئندہ کبھی آپ کو گالی دوں تو گویا اپنے باپ کو دوں۔

مولانا جس راستے سے بھی آتے، انھیں اس دکان سے گزرنا پڑتا تھا۔ اس جگہ پر آج کل میاں سنٹر بن چکا ہے۔ یہاں پر کبھی عبدالطیف یزدانی نے اِسلامی کتب خانہ قائم کر رکھا تھا۔ اس جگہ کا مالک نذیر بھٹے والا تھا۔

اصلاحی خدمات:

چوک نیائیں میں اے ڈی ماڈل ہائی سکول کے قریب کونے میں شریف چائے والے کی دکان تھی، وہاں ایک بہت بڑی چارپائی (منجا) پڑی رہتی جہاں جوایا پہلوان، ککو پہلوان اور دیگر لوگ شام کے وقت محفل لگایا کرتے تھے۔ ایک روز جوایا پہلوان، ککو پہلوان، نذیر بھٹے والا، عبدالرحیم بوتلاں والا اور دیگر افراد منجے پر بیٹھے تاش کھیل رہے تھے کہ دفعتاً جوایا پہلوان کی نظر مولانا پر پڑ گئی تو ساتھیوں سے مخاطب ہوا: ''اوئے! مولوی صاحب آ رئے جے۔'' اور سب نے تاش کے پتے چھپا کر آگے پیچھے کر لیے۔ مولانا وہاں رُکے اور کہا: کیا کرتے ہو؟ ''بس گپ شپ لگا رئے آں۔'' مولانا نے کہا: کچھ خیال کرو، سرِعام ایسی حرکت مناسب نہیں۔

ایک دفعہ اسی مقام پر جوایا پہلوان اور اس کے چند حواری محوِ گفتگو تھے، مولانا سلفی کا وہاں سے گزر ہوا تو جوایا دفعتاً مولانا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ دکان دار اور راہ گیر پریشان ہو گئے کہ کہیں مولانا کے ساتھ

غلط حرکت کا اِرتکاب نہ کر بیٹھے۔اس نے مولانا کے ساتھ مصافحہ کیا اور پوچھا: کیا مجھے پہچانتے ہیں؟ مولانا نے نفی میں سر ہلایا تو بتایا کہ میں اللہ جوایا پہلوان ہوں۔اچھا تُو وہ ہے جو جوایا بدمعاش کے نام سے شہرت رکھتا ہے! کہا: نہیں مولانا! میں شریف آدمی ہوں، کسی کو پریشان اور تنگ نہیں کرتا۔ یہ واقعہ ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار (سابق ڈائریکٹر لاہور میوزیم) کا چشم دید ہے۔ بتایا کہ اس دوران جوایا اپنی نظریں جھکائے رہا اور کیا مجال کہ آنکھ اُٹھا کر اوپر دیکھا ہو۔

یہی جوایا بعد میں مخالف پارٹی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔ جوایا پہلوان ایک دور میں دہشت کی علامت بنا ہوا تھا اور پولیس تک اس پر ہاتھ ڈالنے سے خوف کھاتی تھی۔

سماجی تعلقات:

۱۹۴۵ء میں فضل الٰہی ٹھیکے دار کے ہاں شادی کی تقریب میں مختصر خطاب فرمایا۔اس تقریب میں غلام محمد ڈار، بابو نصیر الدین، مہر وزیر محمد، حاجی محمد اسماعیل کھوکھر، حاجی محمد علی (وفات: ۱۹۵۴ء)، حاجی اللہ دتہ کڑیاں والا اور دیگر عمائدین شریک تھے۔اس موقع پر ٹھیکے دار صاحب نے مولانا کی خدمت میں ایک سو روپے کا نذرانہ پیش کیا۔مولانا نے ہر چند کہ بہت انکار کیا، لیکن وہ رقم مولانا کی جیب میں ڈال کر ہی رہے۔مولانا نے فرمایا: آپ بخوبی جانتے ہیں کہ میں نکاح کی اُجرت قبول نہیں کرتا اور آپ کا یہ اِقدام مناسب نہیں۔مولانا نے بلا تاخیر مسجد کا رُخ کیا اور اولین فرصت میں رسید بنا کر ٹھیکے دار صاحب کو بھجوا دی۔

اسی طرح ۱۹۵۱ء میں اللہ دتہ کڑیاں والا کے فرزند عزیز ذوالفقار (وفات: ۲۰۱۲ء) نے اپنے والد کی یاد میں اے ڈی ماڈل ہائی سکول کی بنیاد رکھی جس کا سنگِ بنیاد مولانا سلفی نے رکھا۔

سادگی، اِنکساری اور بردباری:

مولانا کو نمود و نمائش، خود پسندی اور رعونت سے سخت اجتناب تھا۔ آپ قناعت اور سادگی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔۱۲ جنوری ۱۹۳۳ء کی ڈائری میں رقم طراز ہیں:

''اپنے مصارف کا اندازہ اور آئندہ بجٹ صرف اس رقم سے لگانا چاہیے جو فی الوقت ہاتھ میں موجود اور قابلِ تصرف ہو، کسی کی امانت نہ ہو۔ امسال مجھے اخراجات میں بے حد تکلیف ہوئی۔ یہ تجربہ میری عمر میں پہلی مرتبہ ہوا ہے۔ میں نے تنخواہ کی اُمید پر اخراجاتِ یومیہ کو بدستور رکھا جس سے بعض رقوم بطورِ قرض میرے ذمہ واجب الادا ہیں، لیکن میں ان کو اس لیے ادا نہیں کر سکتا کیوں کہ پورے چار ماہ کی تنخواہ انجمن سے ابھی تک وصول نہیں ہوئی، اس لیے بعض احباب سے ملنا مشکل ہو رہا ہے۔''

تاہم ۲۶ جنوری ۱۹۳۳ء کو چار ماہ کے مشاہرے کی رقم مبلغ دوسو روپے مولانا کو ادا کر دیے گئے۔

آپ نرم خو، حلیم الطبع، دردمند اور وضع دار شخصیت کے مالک تھے۔ ہر طبقے میں ہر دل عزیز اور محترم تھے۔ڈپٹنا، بھڑکنا، جھگڑنا تو انھیں آتا ہی نہیں تھا۔غصہ اگر کبھی آ بھی جاتا تو دیر پا نہ ہوتا، تاہم جماعتی اُمور اور تنظیمی معاملات کے بارے میں بڑے حساس واقع ہوئے تھے۔کسی قسم کی کوتاہی اور بدنظمی سے مزاج میں برہمی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔

آپ خوش مزاج، خوش گفتار، خوش اخلاق اور خوش پوش تھے۔ قراقلی اور کبھی کپڑے کی ٹوپی سر پر رہتی۔ایک ہاتھ میں عمدہ چھڑی، دوسرے میں کبھی کبھار کتاب رکھتے۔ وقت کے قدردان اور پابندیِ وقت کے معاملے میں بہت محتاط تھے۔جیبی گھڑی ہمیشہ جیب کی زینت بنی رہتی۔آنکھوں پر چشمہ ہوتا۔شلوار، پاجامہ اور لنگی کا اِستعمال بھی کرتے۔قمیص، کوٹ اور خاص مواقع پر شیروانی پہنتے۔سرِراہ کوئی مل جاتا تو علیک سلیک میں بازی لے جاتے۔ خیر و عافیت دریافت کرتے۔ لوگ اپنے مسائل لے کر آتے، پوری توجہ سے سنتے۔ مقدمات اور دیگر معاملات میں خوش اسلوبی کے ساتھ مصالحت اور راضی نامے ہی کرا دیتے۔نزاعی مسائل سے پہلو بچا کر نکل جاتے۔

مولانا عام طور پر پاؤں پر چمڑے کے موزے چڑھائے رہتے۔سردی کے دن تھے،انھوں نے موزوں پر مسح کر کے وضو مکمل کیا۔ان کے ساتھ ہی پیر میر حیدر شاہ بھی وضو کرنے میں مصروف تھے۔ جب مولانا وضو سے فارغ ہوکر اُٹھ کھڑے ہوئے تو میر صاحب نے آواز لگائی: ''مولانا! ہم نے بھی آپ کے پیچھے نماز پڑھنی ہے۔'' مولانا اس لطیف فقرے سے محظوظ ہوئے، الٹے پاؤں واپس ہوئے،موزے اُتارے اور ٹھنڈے پانی سے دوبارہ وضو کیا۔ پیر میر حیدر شاہ راسخ العقیدہ موحد تھے۔تمام نمازیں مولانا ہی کی اقتدا میں ادا کرتے تھے۔مسجد کے قریب ہی انھوں نے مختصر سا کاروبار جما رکھا تھا۔

مولانا سلفی رحمہ اللہ کا فیاضی اور سخاوت سے فطری میلان تھا۔کسی سائل کو خالی ہاتھ لوٹانا انھیں گوارا نہیں تھا۔ان کی ایک خاص ادا یہ تھی کہ ملنے والوں کی باتیں غور سے سنتے۔خود باعمل تھے اور عمل ہی کو کامیابی کا زینہ قرار دے رکھا تھا۔انھوں نے عوام میں عمل کا ذوق پیدا کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں دیانت، امانت،متانت اور خدمتِ خلق کی خوبیوں سے مزین کر رکھا تھا۔جماعت کے مخیّر افراد ان کی جیبیں بھر کر رکھتے۔ان پر لوگوں کے اعتماد کا عالَم یہ تھا کہ معروف صنعت کار حاجی اللہ دتہ کڑیاں والا، حاجی محمد اِسماعیل کھوکھر، حاجی محمد علی اور دیگر عقیدت مند حاجت مندوں کی اِعانت کے سلسلے میں وافر رقم ان کے سپرد کیے رہتے۔ اس کارِ خیر و برکت میں حاجی اللہ دتہ باقی مخیّر حضرات سے سبقت لیے رہتے تھے۔

مولانا کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ حاجت مندوں کو ذاتی ضمانت پر قرض لے دیا کرتے تھے۔وہ خود بھی اس کارِ خیر میں کسی سے کم نہیں تھے،اپنی بساط کے مطابق ضرورت مند افراد کو قرض دے دیا کرتے تھے۔(جاری ہے)

09\Ishtihar.jpg not found.

قسط نمبر ۳

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے حضور میں

(بیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی)

جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)

معمولات:

مولانا جب کبھی دوسرے شہروں کے دوروں سے نصف شب کے بعد گوجرانوالہ پہنچتے تو براہِ راست مسجد میں چلے آتے اور عبادت، نوافل اور اذکار میں مصروف رہتے۔ اگر نصف شب سے پہلے واپسی ہو جاتی تو گھر چلے جاتے جہاں قدرے اِستراحت کے بعد تہجد کی نماز پڑھتے۔ مولانا جس روز گوجرانولہ میں موجود ہوتے تو مسجد میں ضرور پہنچتے اور تمام جماعتوں کی اِمامت خود کراتے۔ وہ منصبِ امامت کو خطابت سے کہیں ارفع و اعلیٰ سمجھتے۔ مولانا کی غیر موجودگی میں مسجد کے بعض نمازی یہ فریضہ انجام دیتے۔ عام طور پر یہ منصب حاجی اسماعیل کھوکھر نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا۔ مولانا سلفی حاجی صاحب کو احتراماً ''امام صاحب'' کہہ کر مخاطب کرتے۔ حاجی اسماعیل صاحب عمر میں مولانا سلفی سے کہیں بڑے تھے، ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک ملاقات میں بتایا کہ حاجی محمد اسماعیل ایک سو پچیس سال سے زائد کی طویل عمر پا کر ۱۹۶۷ء میں راہیِ عدم ہوئے۔

مولانا سلفی مسجد میں اذانِ فجر سے کہیں پہلے تشریف لے آتے۔ طلبہ کی نگہداشت اور دیکھ بھال کرتے۔ کسی طالبِ علم کو سردی سے ٹھٹھرتا محسوس کرتے تو لحاف سے ڈھانپ دیتے۔ مولانا سلفی طلبہ کی اخلاقی تربیت کا بہت خیال رکھتے اور اخلاقی گراوٹ کو قطعاً برداشت نہ کرتے۔ طلبہ کی رہائش گاہوں کے قریب کسی غیر متعلقہ شخص کو پھٹکنے کی اجازت نہیں تھی!

بیرونِ شہر سے کوئی عالم مسجد میں تشریف لاتے تو مولانا مسندِ خطابت انھی کے سپرد کر کے خود حلقۂ سامعین میں شامل ہو جاتے۔ مولانا سلفی کی موجودگی میں مولانا محمد سورتی (وفات: ۱۹۴۳ء)، مولانا عبدالقادر قصوری (وفات: ۱۹۴۲ء)، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبداللہ ثانی اور دیگر علماء رحمہم اللہ نے درس دیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمہ اللہ گوجرانوالہ تشریف لے آئے اور مختصر عرصے کے لیے گوجرانوالہ میں مقیم رہے۔ ان کے ایک معتقد سید احمد ثنائی انھیں سائیکل پر بٹھا کر مسجد لے آتے۔ خطبۂ جمعہ کے دوران مولانا امرتسری کی آمد پر حضرت شیخ الحدیث فوراً منبر سے دستبردار ہو جاتے اور مولانا سے خطبہ جاری رکھنے کی درخواست کرتے۔ مولانا سلفی قرب و جوار میں خطاب کے لیے تشریف لے جاتے تو شیخ محمد یوسف اور شیخ فضل حق ان کے ہم رکاب ہوتے، انھی کی زبانی معلوم ہوا کہ تقریر کا معاوضہ کبھی قبول نہ کرتے۔

سید عبدالغنی شاہ رحمہ اللہ (وفات: ۱۹۸۹ء) تقریر کے لیے جب گوجرانوالہ آتے تو احباب دعوتِ طعام میں مولانا سلفی کو بھی مدعو کر لیتے۔ سید صاحب نے انتظامیہ کو کہہ رکھا تھا کہ وہ مولانا کی موجودگی میں تقریر نہیں کر سکیں گے۔ مولانا تقریر کے بعد جب جلسہ گاہ سے اُٹھ جاتے تو شاہ صاحب بعد میں خطاب فرماتے۔

جون ۱۹۵۱ء میں مولانا مسجد کے صحن میں چارپائی پر بیٹھے طلبہ سے تربیتی خطاب کر رہے تھے، اسی اثنا میں بھارت سے آل انڈیا اہلِ حدیث کانفرنس کے صدر مولانا عبدالوہاب آروی رحمہ اللہ (وفات: ۱۹۸۳ء) تشریف لے آئے۔ بروایت میاں اسماعیل ضیاء مولانا سلفی گفتگو فرما رہے تھے۔ کئی علماء اور طلبہ فرش پر بیٹھے ہمہ تن گوش تھے اور ادب و توجہ کا یہ عالَم تھا کہ سب نظریں جھکائے ہوئے تھے۔ اسی دوران پچھلی جانب سے مولانا عبدالوہاب آروی کی تشریف آوری

ہوئی۔ مولانا جو اپنا بیان جاری رکھے ہوئے تھے، دفعتاً خاموش ہوگئے۔ مولانا عبدالوہاب آروی کو دیکھتے ہی سامعین کے ساتھ جا کر براجمان ہوگئے اور چارپائی ان کے لیے خالی کردی۔ مولانا آروی نے کہا کہ بیان جاری رکھیں، لیکن مولانا سلفی نے خطاب روک دیا۔

یومِ آزادی کے سلسلے میں ایک مشترکہ جلسہ ڈپٹی کمشنر کی زیرِ صدارت شیراں والا باغ میں ہوا۔ مقررین میں مفتی عبدالواحد، مفتی بشیر حسین، مفتی جعفر حسین اور مولانا عبدالعزیز چشتی شامل تھے۔ جوشِ خطابت میں مفتی بشیر حسین نے اپنی تقریر میں ڈی سی کو مخاطب کرتے ہوئے ''ڈی سی رحمۃ اللہ علیہ'' کہہ دیا جس پر جلسے میں حیرت کا اظہار کیا گیا اور قہقہے لگائے گئے۔ سامعین ہنسی ضبط نہ کر سکے جس پر مولانا سلفی نے وضاحت کی کہ ہم سب اللہ کی رحمت کے محتاج ہیں۔ زندہ اور مُردہ دونوں اللہ کی رحمت کے حق دار اور طلب گار ہیں۔ اس جلسے میں راقم نے مولانا سلفی اور مفتی عبدالواحد کو عربی میں روانی سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا۔ دونوں میں گہرے مراسم اور بے تکلفانہ تعلقات تھے۔

راست بازی اور بے باکی:

۲۰ جون ۱۹۵۹ء میں احمد نگر (گوجرانوالہ) میں ایک جلسے سے خطاب میں فوجی حکومت کے خلاف مولانا سلفی نے سخت الفاظ کہہ دیے۔ قابلِ اعتراض اور اشتعال انگیز تقریر کے اِلزام میں اظہارِ وجوہ کا نوٹس دیا گیا اور پنجاب پبلک سیفٹی ایکٹ ۱۹۴۹ء کے سیکشن ۵ (۱، ڈی) کے تحت وارننگ دی گئی۔ ۱۴ جولائی کو پولیس نے مولانا کی رہائش گاہ پر دھاوا بول دیا۔

۱۹۶۲ء میں معروف ترقی پسند اخبارات ''امروز''، ''پاکستان ٹائمز'' اور ''لیل ونہار'' کے مالک اور بانی میاں افتخار الدین کی وفات پر ایک تعزیتی جلسہ بالمقابل پرانا ریلوے سٹیشن منعقد ہوا۔ یہ ایوب خانی تسلط کے جبر واستبداد کے عروج کا زمانہ تھا۔ آزادیِ تقریر وتحریر کو سختی کے ساتھ کچلا جا رہا تھا۔ اخبارات سنسر کے بغیر شایع نہیں ہو سکتے تھے اور عوامی اجتماعات پر پابندی تھی۔ بنیادی حقوق تک سلب کر لیے گئے تھے۔ ان نامساعد حالات میں یہ جلسہ لاؤڈ سپیکر کے اِستعمال کے بغیر منعقد کیا گیا۔ سامعین کی تعداد سوڈیڑھ سو سے زائد نہیں تھی۔ چاٹگام (مشرقی پاکستان) سے رکنِ اسمبلی عبدالحق نے اپنے خطاب میں آمریت کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا جس کے بعد مولانا سلفی نے صدارتی خطاب میں ولولہ انگیز اور پُرجوش انداز میں حکومتِ وقت کو انگریز کے نوآبادیاتی نظامِ حکومت کا تسلسل قرار دیا۔ مولانا کی تقریر ابھی جاری تھی کہ عبدالحق اپنی نشست سے اُٹھ کر مولانا سے بغل گیر ہوگئے، کہا کہ ہمیں اپنے انقلابی ہونے پر بڑا ناز ہے، لیکن آپ تو ہم سے بھی کہیں بڑھ کر اِنقلابی ہیں! بظاہر دھان پان ہیں، لیکن دل جوان رکھتے ہیں!

فریضۂ حج:

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کو دو دفعہ فریضۂ حج ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ پہلی دفعہ ۱۹۲۶ء میں حج کیا اور شاہ عبدالعزیز بن سعود سے ملاقات ہوئی۔ اسی سفر میں شیخ محمد بن عبداللطیف آلِ شیخ اور شیخ ابوبکر خوقیر رحمہ اللہ سے اجازتِ حدیث کی سعادت حاصل ہوئی۔ اس وقت گوجرانولہ میں مدرسہ محمدیہ کا قیام عمل میں آچکا تھا اور تدریس کا کام جاری تھا۔ مولانا حج پر تشریف لے گئے تو درس وتدریس کا نظام متاثر ہوا۔ اس سلسلے میں ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر۔ ۲۲ جولائی ۱۹۲۶ء کے شمارے) میں مندرجہ ذیل اِطلاع شایع ہوئی:

> ''مولانا اسماعیل سلفی صاحب کے حج بیت اللہ تشریف لے جانے کی وجہ سے مدرسہ محمدیہ کے جو طلبہ دیگر مدارسِ عربیہ میں چلے گئے تھے، ان کی اطلاع، نیز دیگر شائق طلبہ کے لیے اعلان کیا جاتا ہے کہ مدرسہ محمدیہ (گوجرانوالہ) میں مولوی عبدالحق صاحب فیروز پوری نے درس تدریس کا کام شروع کر دیا ہے اور مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی ان شاء اللہ عنقریب حج سے فارغ ہو کر واپس تشریف لانے والے ہیں۔ اس لیے شائق طلبہ اس مدرسے میں جلد آجائیں۔ قیام وطعام طلبہ کی کفیل حسبِ وسعت انجمن اہلِ حدیث گوجرانوالہ ہوگی۔''

دوسری بار ۶ ستمبر ۱۹۴۹ء میں سفرِ حج کے لیے صبح ۴ بجے کی ٹرین سے

کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ کراچی میں مولانا اسماعیل غزنوی (وفات: ۱۹۶۰ء) اور دوسرے احباب نے اُن کا اِستقبال کیا۔ ۱۲ستمبر کو سعودی سفیر شیخ عبدالحمید خطیب سے ملاقات کی۔ ۱۷ستمبر کو بحری جہاز سے عازم جدہ ہوئے۔ مولانا اسماعیل غزنوی اور حاجی محمد یعقوب کی کوشش سے مولانا کو بہت اچھی اور آرام دہ نشست مل گئی۔ ۲۶ستمبر کو جہاز جدہ بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ الشیخ ابوبکر خوقیر نے مولانا کے لیے کار بھجوادی اور مولانا مکہ روانہ ہوگئے جہاں مولانا مسعود عالم ندوی رحمہ اللہ سے اُن کی ملاقات ہوئی اور اُن سے یک جائی کے مواقع حاصل ہوئے۔ ۱۲۶کتوبر کو مدینہ منورہ پہنچے۔ اُن کا قیام دارالحدیث میں رہا، پھر واپسی پر ۵نومبر کو جدہ پہنچے جہاں شیخ محمد نصیف، شیخ حامد فقی، شیخ احمد شاکر اور دیگر علماء رحمہم اللہ سے ملاقات ہوئی۔ ۲۹ نومبر دس بجے صبح سندھ ایکسپریس سے گوجرانوالہ پہنچے اور کسی کو خبر تک نہ ہونے دی۔ ریلوے اسٹیشن پر اُن کے بیٹے مولانا حکیم محمود سلفی رحمہ اللہ (وفات: ۱۹۹۴ء) موجود تھے۔ مولانا نے سامان گھر بھجوادیا اور خود مسجد چلے گئے۔

علمائے احناف سے تعلقات:

ایوب خانی دور میں عیدالفطر کا چاند بعض مقامات پر دیکھا گیا جس کے مطابق عید جمعہ مبارک کو آرہی تھی، لیکن ایوب خان کا گمان یہ تھا کہ اگر جمعہ کے روز دو خطبے پڑھے گئے تو یہ اس کے زوال کی علامت ہوگی، چنانچہ ریڈیو پر چاند کی خبر نشر نہیں ہونے دی جا رہی تھی۔ مسجد میں نمازِ تراویح ادا کرنے کے بعد نمازیوں نے تذبذب کے عالَم میں مولانا سلفی سے عید کے بارے میں پوچھنا شروع کر دیا۔ مولانا نے کہا: عید کس روز ہوگی، اس کا فیصلہ ہم نہیں، بلکہ مفتی عبدالواحد (وفات: ۱۹۸۲ء) نے کرنا ہے۔ جو فیصلہ وہ کریں گے، ہم اسی پر عمل کریں گے۔ چنانچہ جماعت کے تین سرکردہ احباب مسجد شیراں والا میں مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، مفتی صاحب نے فیصلہ دے دیا کہ عید جمعہ کے روز ہی ہوگی جس کے بعد مولانا سلفی نے جمعہ کو عیدالفطر ہونے کا اعلان کردیا۔ مفتی عبدالواحد صاحب وسیع الظرف، معتدل مزاج، جید عالم اور مسلکاً حنفی دیوبندی تھے۔

علمائے احناف مولانا غلام اللہ خان (وفات: ۱۹۸۰ء)، سید عنایت اللہ شاہ بخاری، مولانا مفتی عبدالواحد، صوفی عبدالحمید، قاضی شمس الدین اور مولانا محمد چراغ (وفات: ۱۹۸۹ء) سے برادرانہ اور مخلصانہ تعلقات قائم تھے۔ مولانا غلام اللہ خان اور مولانا سید عنایت اللہ بخاری نے کئی دفعہ مسجد میں منعقد ہونے والے جلسوں سے خطاب فرمایا۔

مولانا سلفی علمائے دیوبند کو بے حد عزت واحترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ مفتی محمد حسن گوجرانوالہ تشریف لاتے تو انھیں مفتی صاحب کی ٹانگیں اپنے ہاتھوں سے دباتے دیکھا۔ مفتی صاحب جب جون ۱۹۶۱ء میں وفات پاگئے تو خطبۂ جمعہ میں اپنے استاد کی یاد میں رطب اللسان اور مغفرت کے لیے دیر تک دست بہ دُعا رہے۔ ان کی آوز بھرا گئی اور وہ آبدیدہ ہوگئے۔ مولانا محمد اسماعیل سلفی نے امرتسر میں مفتی صاحب سے تعلیم حاصل کی تھی۔ فرمایا کہ میں اپنے شفیق اور مہربان استادِ گرامی کے سایۂ شفقت سے محروم ہوگیا ہوں۔

۱۶مارچ ۱۹۴۱ء کو مولانا اہلِ حدیث کانفرنس فتح گڑھ چوڑیاں میں شرکت کے لیے ٹرین میں محوِ سفر تھے، اسی اثنا میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی (وفات: ۱۹۸۴ء) سے آمنا سامنا ہوگیا۔ چشتی صاحب مولانا سے تحریک اہلِ حدیث کے بارے میں جاننے کے متمنی ہوئے۔ وہ مولانا کی گفتگو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ مطمئن ہوئے اور مسرت کا اِظہار کیا۔ مولانا نے یہ تاثر لیا کہ وہ مسلک اہلِ حدیث سے رغبت رکھتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس ملاقات سے پہلے چشتی صاحب کا حمایتِ حدیث میں ایک مضمون ''ضرورتِ حدیث'' کے عنوان سے ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر۔ ۲۶جولائی ۱۹۴۰ء) میں شایع ہوچکا تھا۔

تحریک ختمِ نبوت:

تحریک ختمِ نبوت کے دوران مولانا سلفی کو ۲۸ فروری ۱۹۵۳ء کو گرفتار کر کے ملتان جیل میں پابندِ سلاسل کردیا گیا۔ جیل میں ان کے ساتھ مولانا ابوالحسنات قادری، مولانا عبدالرحمان ڈکٹیٹر، ممتاز صحافی

عبدالغفار اثر، صاحبزادہ پیر فیض الحسن شاہ کے علاوہ کئی حنفی علماء بھی زیرِحراست تھے۔ قید کے دوران مولانا کو دیگر مسالک کے علماء سے مجالست ومکالمت کا موقع ملا جس سے ان کے درمیان برادرانہ اور قریبی تعلقات استوار ہوگئے۔

جیل میں باجماعت نماز ادا کی جاتی۔ مولانا زہد وتقویٰ اور علم وعمل کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے۔ یہ ایسا وصف تھا کہ ہر ملنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ اس موقع پر یہ مولانا ہی تھے جن سے امامت کرانے پر اِصرار کیا جاتا۔ مولانا سلفی منصبِ امامت کی قدروقیمت سے بخوبی آگاہ تھے اور اسے خطابت سے کہیں برتر مانتے تھے۔ انھوں نے امامت کی عزت وآبرو کا علم کبھی سرنگوں نہیں ہونے دیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب کا سامنا جب اہلِ حدیث حضرات سے ہوتا تو برملا کہہ اُٹھتے کہ ''میں بھی اہلِ حدیث ہوں، میں نے مولانا سلفی کی اقتدا میں کئی نمازیں ادا کرنے کا شرف حاصل کر رکھا ہے!''

بعد میں یہ تمام قیدی سینٹرل جیل لاہور میں منتقل کردیے گئے۔ (بروایت عبدالرحمان ڈکٹیٹر) عدالت میں مقدمے کی سماعت ہوئی تو جج نے مولانا ابوالحسنات قادری صاحب سے استفسار کیا کہ آپ مرزائیوں پر کفر کا فتویٰ لگاتے ہیں اور اہلِ حدیث واہلِ دیوبند کو بھی کافر قرار دیتے ہیں! جج نے کتابوں کا حوالہ بھی دیا اور کہا کہ آپ کی کتابوں میں ان کو کافر لکھا گیا ہے۔ جیل میں قید تمام علماء نے باہم یہ طے کر رکھا تھا کوئی اختلافی بیان نہیں دیا جائے گا۔ مولانا ابوالحسنات نے مولانا سلفی کی طرف اِشارہ کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہم نے جہاں بھی انھیں کافر لکھا ہے، اس سے مراد فقہی کافر ہیں، حقیقی نہیں، جب کہ مرزائی حقیقی کافر ہیں! اس پر مولانا نہ رہ سکے، ازراہِ لطافت ابوالحسنات صاحب سے مخاطب ہوئے کہ ہم تو فقہی کافر ہیں اور آپ حقیقی کافر ہیں۔ اس سے جج صاحب بہت محظوظ ہوئے اور عدالت میں قہقہے بلند ہوئے۔

مولانا دس ماہ اور دس دن پابندِ سلاسل رہ کر ۱۰ جنوری ۱۹۵۴ء کو سنٹرل جیل لاہور سے رہا ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں تین ماہ کے لیے نظر بند کردیا گیا اور ان کی زبان بندی بھی کردی گئی۔ اس دوران انھیں شہر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ کسی دوسرے مقام پر جاسکتے تھے اور نہ کوئی تقریر کرسکتے تھے۔ جمعہ کا خطبہ دینے پر بھی پابندی عائد کردی گئی۔ ہرچند کہ معززینِ شہر اور احباب کا تقاضہ تھا کہ وہ جمعہ کا خطبہ ضرور اِرشاد فرمائیں، لیکن مولانا نے قانون کو ہاتھ میں لینا مناسب نہیں سمجھا۔ ۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء کو مولانا نے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کی اور پابندی کے متعلق بعض اُمور کی وضاحت طلب کی، لیکن اس نے کوئی خاطر خواہ جواب نہیں دیا، تاہم ۱۸/اپریل ۱۹۵۴ء کو رات ۱۲ بجے تین ماہ کی پابندی کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۹/اپریل کو اس نوٹس کی تعمیل ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی خفیہ پولیس نے مولانا کی رہائش کا گھیراؤ کرلیا۔

اسیری کے ایام میں مولانا کی تنخواہ نصف کردی گئی، لیکن انھوں نے اس کا بُرا مانا اور نہ کوئی حرفِ شکایت زبان پر لائے۔ رہائی کے بعد ایک اجلاس میں مولانا کے مشاہرے میں تخفیف پر قاضی عبدالرحیم صاحب (وفات: ۱۹۷۱ء) نے شرکائے اجلاس کو متوجہ کیا اور اس کی تلافی کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے موقف اِختیار کیا کہ مولانا اپنے کسی ذاتی مفاد کی خاطر جیل نہیں گئے، بلکہ ایک مذہبی اور قومی فریضے کی پاداش میں انھیں قیدوبند کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس پر اجلاس کے شرکاء نے ندامت کا اِظہار کیا اور غلطی کا اِعتراف کرتے ہوئے بقیہ رقم ادا کردی۔

مسجد شہید گنج:

مسجد شہید گنج پر سکھوں نے قبضہ جما رکھا تھا جسے قانونی تحفظ بھی حاصل تھا۔ مسلمانوں نے عدالت میں یہ دعویٰ کر رکھا تھا کہ انھیں مسجد میں نماز پڑھنے سے نہ روکا جائے جسے عدالت نے خارج کردیا۔

مارچ ۱۹۳۵ء میں ''گوردوارہ پربندھک کمیٹی'' کو مسجد شہید گنج کا قبضہ مل گیا۔ ۲۸ جون کو مسجد گرانے کی ابتدا ہوئی۔ ۹ جولائی ۱۹۳۵ء کی صبح تک مسجد کے تمام آثار معدوم کردیے گئے اور حکمِ امتناعی کی خلاف

ورزی کرتے ہوئے نئی تعمیرات کھڑی کر دی گئیں۔ ۲۰ جولائی کو ردِعمل کے طور پر مسلمان بڑی تعداد میں جمع ہوگئے اور دیوانہ وار مسجد کی طرف بڑھنے لگے۔ پولیس نے پہلے لاٹھی چارج اور آنسو گیس سے مظاہرین کو منتشر کرنے کی کوشش کی جس سے لوگ مشتعل ہوگئے۔ اس کے ساتھ ہی گورنر پنجاب ایمرسن کے حکم پر کرفیو نافذ کر دیا گیا اور مظاہرین پر فائر کھول دیا گیا جس سے دس سے زائد مسلمان شہید ہوگئے۔ مولانا اور ان کے معتمد ساتھی ملک لال خان اس مظاہرے میں شریک تھے۔

۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء میں مولانا مرحوم مسجد شہید گنج کے متعلق ایک میٹنگ میں شرکت کے لیے لاہور گئے، لیکن کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ دوسرے روز پھر میٹنگ ہوئی، کشیدہ ماحول اور طویل بحث مباحثے کے بعد مندرجہ ذیل تجاویز پر اتفاق کیا گیا:

① سکھوں کی مذمت۔ ② حکومت کی مذمت۔ ③ مسجد کا شایانِ شان تحفظ۔ ④ شہداء کا خون بہا۔ ⑤ قیدیوں کی غیر مشروط رہائی۔

چونکہ مولانا لاہور کے احتجاج میں بنفسِ نفیس شامل تھے اور مظاہرین پر روا رکھے جانے والے تشدد کے چشم دید گواہ تھے، اس لیے مقدمے میں گواہی کے لیے مولانا کو بھی طلب کیا گیا۔ ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو مولانا مقدمہ مسجد شہید گنج میں گواہی دینے کے لیے لاہور گئے۔ لاہور ریلوے سٹیشن پر مولانا عبدالقادر قصوری موجود تھے، ان سے مشاورت ہوئی، لیکن عدالت میں اس روز گواہی نہ ہوسکی، صرف چار شہادتیں ہی قلم بند ہوسکیں۔

۲۴ مارچ ۱۹۳۶ء کو مولانا کی گواہی ہوئی، پھر ۱۶ نومبر ۱۹۳۶ء کو مقدمے کے سلسلے میں لاہور کا سفر کیا اور مولانا عبدالقادر قصوری سے اس معاملے پر گفتگو ہوئی۔

۸ نومبر ۱۹۳۵ء میں یومِ شہید گنج کے موقع پر شیراں والا باغ میں اجتماعی جمعہ کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام مسالک کے علماء اور عوام نے شرکت کی۔ مولانا کی طبیعت ناساز تھی، مگر علماء اور عوام کے اِصرار پر خطبہ مولانا ہی نے اِرشاد فرمایا۔

انجمن تحفظِ کشمیر:

کشمیر میں مسلمانوں پر ڈوگرہ راج کے مظالم کے خلاف گوجرانوالہ میں ''انجمن تحفظِ کشمیر'' کا قیام عمل میں لایا گیا۔ فیصلے کے مطابق احتجاجی مظاہروں کا آغاز کیا گیا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۳۱ء کو کشمیر ایجی ٹیشن کے سلسلے میں ریلوے سٹیشن کے قریب مولانا سلفی کی زیرِ قیادت رضا کاروں کا مظاہرہ جاری تھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہوگیا۔ رضا کار نماز ادا کرنے کی تیاری میں تھے کہ مجسٹریٹ لالہ مکھراج نے اذان کہنے اور نماز پڑھنے سے روک دیا۔ رضا کاروں نے مزاحمت کی جس پر مولانا اور دیگر رضا کاروں کو تین تین ماہ کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔ (باقی آئندہ)

❀❀❀

قسط نمبر ۴ آخری

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ کے حضور میں

(بیاد شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفی)

جناب ضیاء اللہ کھوکھر (گوجرانوالہ)

فلم ''حج'' کی نمائش:

۱۹۵۰ء میں گوجرانوالہ کے نشاط سینما میں فلم ''حج'' چلانے کا اعلان کیا گیا جس کے خلاف ۲۰ جنوری کو نشاط سینما کے سامنے مظاہرہ کیا گیا۔ ابتدا میں مظاہرین کی تعداد کم تھی، لیکن رفتہ رفتہ بہت زیادہ ہوگئی۔ پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا اور مظاہرین کے علاوہ ایک پولیس والا بھی زخمی ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی سینما کی انتظامیہ نے نمائش روکنے کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔ اس کے اگلے روز پولیس نے مولانا سلفی، مفتی عبدالواحد، بشیر راغب اور دیگر افراد پر مقدمہ درج کر کے انھیں گرفتار کر لیا۔ رات کو چوک نیائیں میں احتجاجی جلسہ ہوا جس سے مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی، ملک لال خان اور دیگر مقررین نے خطاب کیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ ۲۲ جنوری کو ہڑتال کی جائے گی اور یہ کہ گرفتار شدگان ضمانت نہیں کرائیں گے۔ فیصلے کے مطابق شہر میں مکمل ہڑتال رہی اور متعدد احتجاجی جلوس نکالے گئے۔ ۲۶ جنوری کو رہنماؤں کو رہا کر دیا گیا۔

مولانا کا موقف یہ تھا کی حج ایک مقدس فریضہ ہے جس کی سینما میں نمائش سے حج کا تقدس مجروح ہوتا ہے۔

قید و بند:

مولانا نے اپنی سرگرمیوں کا میدان درس و تدریس اور امامت وخطابت ہی تک محدود نہیں رکھا تھا۔ بلاشبہ وہ ایک کامیاب مدرّس، مبلغ، خطیب اور صاحبِ طرز انشا پرداز کی پہچان رکھتے تھے۔ ان کے علمی و تحقیقی مضامین ملک کے موقر رسائل کی زینت بنے رہتے۔ حتی المقدور ملکی سیاست میں بھی متحرک اور فعال رہے۔ ان کا شمار آزادیِ ہند کے سرکردہ رہنماؤں اور انگریزی استعمار کے شدید مخالفین میں ہوتا تھا۔ آزادیِ ہند کی جدوجہد میں وہ استقامت، جرأت، ثابت قدمی اور مضبوطی کے ساتھ اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ اس سلسلے میں انھیں انگریزی حکومت کے جبر و استبداد، جور و ستم اور قید و بند کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے تحریکِ خلافت، تحریک تحفظ مسجد شہید گنج، تحریکِ حریتِ کشمیر، ترکِ موالات اور نوجوان بھارت سبھا میں بھرپور اور فعال حصہ لیا۔ وہ جمعیۃ العلماء ہند اور انڈین نیشنل کانگرس کے رکن تھے۔

برطانوی سامراجی حکومت نے نمک پر محصول ٹیکس عائد کر دیا جس سے عوام میں تشویش کی لہر دوڑ گئی اور اس کے خلاف مظاہروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ غیر ملکی اشیاء، خاص طور پر بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ کی مہم چلائی گئی۔ غیر ملکی سامان، سگریٹ کی دکانوں کے علاوہ شراب خانوں پر پکٹنگ (Picketing) کی گئی۔ مکمل آزادی اور خودمختاری کے لیے ہندوستان بھر میں یکم جنوری ۱۹۳۰ء سے سول نافرمانی کی تحریک کا آغاز کیا گیا۔

تحریک نمک سازی میں مولانا محمد اسماعیل سلفی مکمل طور پر فعال اور متحرک رہے، چنانچہ ستمبر ۱۹۳۰ء میں زیر دفعہ ۱۴۳ تعزیراتِ ہند چار ماہ قید کی سزا سنائی گئی۔ اسی تحریک میں مولانا ابوالکلام آزاد چھ ماہ قید کی سزا پا کر الموڑہ جیل میں ڈال دیے گئے تھے۔ اسی جرم کی پاداش میں قبل ازیں مولانا عبدالقادر قصوری چار ماہ کے لیے گجرات جیل میں بند کیے جا چکے تھے۔ سزا مکمل ہونے کے بعد ان کے خلاف اپریل ۱۹۳۰ء میں حکومت مخالف تقریر کرنے کے اِلزام میں بغاوت کا مقدمہ چلانے کا اعلان کیا گیا۔ مولانا محمد داود غزنوی (وفات: ۱۹۶۳ء) بھی سزایاب ہو کر جیل جا چکے تھے۔

پاک بازار:

گرجاکھی دروازے کے قریب پاک بازار ہے جو دیگاں والا بازار میں جا کھلتا ہے۔اس بازار کا سابقہ نام ''کنجریاں والا بازار'' تھا۔ بازار کی بالائی منزلوں میں عصمت فروشی کا دھندا ہوا کرتا تھا اور بینڈ باجوں کی آوازیں کانوں میں گونجا کرتی تھیں۔شرفاء اس بازار سے گزرنا معیوب جانتے تھے۔ غالباً ۱۹۵۲ء میں مولانا سلفی نے ڈپٹی کمشنر سے رابطہ کیا اور بازار کو ان خرافات سے پاک کرنے کا مطالبہ کیا،لیکن اس نے پس وپیش سے کام لیتے ہوئے معاملہ لٹکائے رکھا۔مولانا کے احتجاج پر اِنتظامیہ نے چند دن کی مہلت طلب کی،لیکن کچھ پیش رفت نہ ہوسکی۔اس پر مولانا کی قیادت میں تحریک چلائی گئی جس میں مفتی عبدالواحد،مفتی بشیر حسین، مولانا عبدالرحمان ڈکٹیٹر،راز کاشمیری اور عبدالغفار اثر نے کلیدی کردار ادا کیا۔اس سلسلے میں گرجاکھی دروازے میں ایک احتجاجی جلسے کا اِہتمام کیا گیا جس میں تمام مسالک کے علماء نے شرکت کی۔ جلسے میں بریلوی حضرات کی نمائندگی مولانا عبدالغفور ہزاروی نے کی۔ حضرت شیخ الحدیث سلفی کے صدارتی خطاب کے بعد مولانا ہزاروی نے تقریر کی اور کہا کہ مولانا نے پندرہ منٹ کی تقریر میں جو نکات بیان کیے ہیں،وہ میں پندرہ روز میں بھی بیان کرنے سے قاصر ہوں!

بالآخر ڈپٹی کمشنر نے ایک اجلاس طلب کیا۔ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار نے بتایا کہ اس اجلاس میں طوائفوں نے یہ موقف اِختیار کیا کہ انھیں متبادل جگہ دے دی جائے تو وہ یہاں سے اُٹھ جائیں گی۔اور اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ انھیں نکاح کے بعد شریفانہ زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔ڈار صاحب نے کہا کہ پنجاب بھر میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد واقعہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ سے ملاقات:

جمعیت اہلِ حدیث کلکتہ کے سالانہ اجلاس میں مولانا سلفی کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ یہ سہ روزہ اجلاس دسمبر ۱۹۳۳ء میں ہائیڈ پارک میں منعقد ہوا تھا۔ مولانا نے ''کامیابی کے لیے عمل کی ضرورت'' کے موضوع پر تقریر کی۔ وہ ۹ دسمبر کو روانہ ہوئے،۱۰ دسمبر کو دہلی پہنچے۔مولانا عبدالرحمان مبارک پوری اور دیگر علماء سے ملاقات ہوئی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے اجلاس میں شامل ہوئے۔اس اجلاس میں گاندھی نے تقریر کی جس سے مولانا متاثر نہیں ہوئے۔۱۳ دسمبر صبح آٹھ بجے کلکتہ پہنچے جہاں ۲۱ دسمبر تک مقیم رہے۔اس دوران مولانا آزاد سے متعدد ملاقاتیں ہوئیں۔وہ اسیرِ آزاد تو تھے ہی،اب ان کے حلقۂ بیعت کے بھی اسیر ہوکر رہے۔

تقسیم ہند:

گوجرانوالہ میں اوائل ۱۹۴۶ء ہی سے ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے تھے۔ضلعی انتظامیہ نے صورتِ حال کو قابو میں لانے کے لیے بااثر معززین پر مشتمل امن کمیٹی بنائی۔معروف صنعت کار اور مزاح نگار عزیز ذوالفقار (سابق صدر پاکستان چیمبر آف کامرس) نے بتایا کہ مولانا محمد اِسماعیل سلفی،مولانا عبدالواحد،عبدالرحیم کھوکھر، باوا ہرکشن سنگھ (پرنسپل گورونانک خالصہ کالج)، جگن ناتھ مونگا (صدر سٹی کانگرس) اور لالہ بھیم سین سچر (بعد میں گورنر مہاراشٹر) اس کمیٹی کے رکن تھے۔

مولانا سلفی نے امن وامان کی فضا قائم رکھنے کے لیے رضا کاروں کی ایک فورس منظّم کی جو فساد زدہ علاقوں میں پہنچ کر شر پسندوں اور لوٹ مار کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے کارروائی کرتی۔اس تنظیم نے کئی غیر مسلموں کو بحفاظت نکال کر محفوظ مقامات تک منتقل کیا۔

۵/اگست ۱۹۴۷ء کو شہر فسادات کی لپیٹ میں آ گیا۔سردار شام سنگھ کے مکان سے فائرنگ کی گئی۔مولانا نے روکنے کی کوشش کی تو ان پر اینٹیں برسائی گئیں اور آتش گیر مادہ بھی پھینکا گیا۔اسی رات لکڑی کے ایک ٹال میں آگ لگا دی گئی۔عبدالرشید پہلوان اور دیگر رضا کار مولانا کی قیادت میں آگ بجھانے میں شریک ہوئے اور حالات پر قابو پایا۔

مولانا نے غیر مسلموں کو بحفاظت نکالنے میں بڑی دلیری اور بہادری دکھائی۔ ہندوؤں اور سکھوں پر حملے کیے جا رہے تھے، انھیں موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا تھا اور ان کی اَملاک کو نذرِ آتش کیا جا رہا

تھا۔ گونداں والا چوک میں آتمارام روڈ پر گوجرانوالہ کے رئیس اور تاجر آتمارام اور ان کے خاندان کو فسادیوں نے گھیرے میں لے لیا۔ مولانا نے کافی جدوجہد کے بعد اس کے اہلِ خانہ کو بحفاظت نکال کر ریلوے سٹیشن پر پہنچا دیا۔

ڈاکٹر سیف الرحمان ڈار نے بتایا کہ آبادی حاکم رائے میں جو مکان خالی ہوئے، ان پر تالے ڈال دیے گئے اور ان کی چابیاں غلام محمد ڈار اور عبدالرحیم کھوکھر کے سپرد کردی گئیں۔ مولانا ضرورت مندوں کو چٹ دیتے اور مکان ان کے لیے کھول دیے جاتے۔ ان میں امرتسر سے آنے والے مسلمانوں کو آباد کیا گیا۔ مولانا کی رہائش اسی محلے میں تھی، ان کی مساعی سے یہ علاقہ فساد کی آگ سے محفوظ رہا۔

شیخ الحدیث رحمہ اللہ کی ڈائری سے:

❁ ۱۲ فروری ۱۹۳۳ء: مولانا ثناء اللہ امرتسری سے ملاقات ہوئی، قادیانیت پر گفتگو ہوتی رہی۔

❁ ۸ مئی ۱۹۳۵ء: رات حاجی محمد عبداللہ کھوکھر (پریذیڈنٹ جمعیت اہلِ حدیث گوجراں والا) وفات پا گئے۔

حاجی عبداللہ صاحب مولانا سلفی کے معتمدِ خاص اور جمعیت کے سرگرم رکن تھے۔ ۱۹۲۶ء میں نائب صدر منتخب ہوئے اور بعد میں صدر بن گئے۔ ہفت روزہ اہلِ حدیث (امرتسر۔ ۳ دسمبر ۱۹۲۶ء) میں اِنتخاب کے حوالے سے مندرجہ ذیل خبر شایع ہوئی:

قاضی عبدالرحیم (صدر)

حاجی محمد عبداللہ کھوکھر رئیسِ اعظم (نائب صدر)

مہر محمد وزیر (ناظم)

غلام محمد ڈار (نائب ناظم)

❁ ۱۷ جولائی ۱۹۳۵ء: ملک لال خان صاحب کی ملاقات کے لیے نوشہرہ ورکاں گئے، واپسی پر ''بڈھا گورائیہ'' سے سواری نہ مل سکی۔ چھ میل کی مسافت پیدل طے کی۔ راستے میں بارش ہوئی۔ ملک صاحب بخیریت ہیں۔ ملک صاحب سے مجوزہ مسجد شہید گنج کانفرنس کے انعقاد پر مشاورت ہوئی۔

❁ ۲۵ مئی ۱۹۳۵ء: منشی عبداللہ معمار سے ملاقات ہوئی۔

❁ ۲۶ مئی ۱۹۳۵ء: جلسہ اہلِ حدیث جہلم میں ''اجتماعی زندگی'' کے عنوان پر تقریر۔ مناظرہ بھی ہوا۔

❁ ۲۷ جولائی ۱۹۳۵ء: صبح لاہور گئے۔ مسجد شہید گنج کے موضوع پر میٹنگ تھی۔ اَحرار اور ان کے حریف حاضر تھے۔ جھگڑا نہایت غیر موزوں طریق سے ہوتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ ہوسکا۔ اگلے روز پھر میٹنگ ہوئی۔

❁ ۸ ستمبر ۱۹۳۵ء بھوپال جانے کے لیے دہلی پہنچے۔ مولانا نور حسین وہیں تھے۔ نواب صدیق حسن خان کی قبر پر گئے، دعا کی گئی۔ تاج المساجد دیکھی۔ وہاں سے آگرہ گئے، تاج محل دیکھا۔

❁ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مرزا بشیر الدین محمود کو مسمّٰی ''اللہ'' کے متعلق خط لکھا۔

❁ ۲۳/ اکتوبر ۱۹۳۵ء بشیر الدین محمود بعض مسائل کی تفہیم کے لیے آئے۔

❁ ۲۴/ اکتوبر ۱۹۳۵ء: خلیفہ قادیان بشر الدین محمود کو مسمّٰی ''اللہ'' کے متعلق یاد دہانی کا خط لکھا۔

❁ ۱۷ فروری ۱۹۴۷ء: آج مہر وزیر محمد صاحب کی عیادت کے لیے لاہور جانا پڑا۔ نسبتاً اچھے ہیں، آپریشن ہو چکا ہے۔

❁ ۲۷/ اپریل ۱۹۳۶ء: استاذِ محترم مولانا محمد ابراہیم صاحب تشریف لائے۔

❁ ۱۴ دسمبر ۱۹۴۱ء: محمد حسین آہن فروش نے مبلغ دو صد روپیہ عاریتاً لیا۔

❁ ۱۹ جون ۱۹۴۳ء: اللہ دتہ کڑیاں والا صاحب نے مبلغ پانچ صد روپیہ غرباء میں تقسیم کے لیے دیا۔

❁ ۲۳ فروری ۱۹۴۷ء: جمعیۃ العلماء کے لیے مبلغ یک صد بطور چندہ۔

❁ ۲۸ فروری ۱۹۴۷ء: میں آغا شورش کاشمیری ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے جماعتی تنظیم کی ضرورت پر زور دیا۔ تقریر بہت

مختصر اور جامع تھی۔

۞ ۱۱ مارچ ۱۹۴۷ء: آج صبح آٹھ بجے فسادات کے خطرے کی وجہ سے تمام دن اور رات کرفیو آرڈر رہا۔ فسادات کا سخت خطرہ تھا، شکر ہے دن آرام سے گزر گیا، تاہم شہر میں بے اعتمادی پائی جاتی ہے۔

۞ ۱۵ مارچ ۱۹۴۷ء: دہلی میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی میٹنگ میں شہر کے خطرات کی وجہ سے نہ جاسکا۔

۞ ۱۶ مارچ ۱۹۴۷ء: آج صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب نے پنڈت نہرو سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کیا، بڑے ہیبت ناک عزائم کا ذکر کیا۔

۞ ۲۵ مارچ ۱۹۴۷ء: حاجی محمد علی گرجاکھی کو مبلغ ایک صد روپیہ عاریتاً دو ماہ کے وعدے پر دیا گیا۔

۞ ۳۰ مارچ ۱۹۴۷ء: محمد حسین نے مبلغ ایک ہزار واپس کیا۔

۞ ۹ جون ۱۹۴۷ء: شہر میں فساد کی ابتدا ہوئی، ایک مسلمان قتل کیا گیا۔ تمام دن رات کرفیو رہا۔ رات کرفیو میں دو سکھوں اور ایک ہندو پر قاتلانہ حملہ ہوا، ایک سکھ بچ گیا اور دو چل بسے۔

۞ ۸ جولائی ۱۹۴۷ء: آج رات بے حد فائرنگ ہوئی۔ قریباً نصف شب تک گولیاں چلتی رہیں۔ شہر میں بے حد ہراس پھیل گیا۔

۞ ۱۱ جولائی ۱۹۴۷ء: آج صبح آٹھ بجے سے شام چار بجے تک کرفیو کھلا۔ نمازِ جمعہ ادا ہوئی۔

۞ ۱۸ جولائی ۱۹۴۷ء: ۵ جولائی کے حادثۂ آتش کے متعلق بیان لیے گئے۔ جو کچھ معلوم تھا، بتادیا۔

۞ ۳/اگست ۱۹۴۷ء: مسجد کے کل پنکھوں کی فٹنگ مکمل ہوئی۔ فی پنکھا اوسط خرچ ۳۴ روپیہ ہوا۔

۞ ۴/اگست ۱۹۴۷ء: پورا ہفتہ فسادات میں گزر گیا۔ تراویح مسجد میں ادا کرنا ناممکن ہوگیا۔

۞ ۱۱/اگست ۱۹۴۷ء: فسادات، کرفیو، شہر میں قتل اور آتش زنی کی وارداتیں ہو رہی ہیں۔

۞ ۱۲/اگست ۱۹۴۷ء: فساد زوروں پر ہیں۔ قتل، آتش زنی اور لوٹ مار کا زور ہے۔ اچھے شریف آدمی اس معصیت میں شریک ہیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا یہ مظاہرہ قابلِ افسوس ہے۔ اپنی جماعت کے افراد بھی اس غارت گری میں کافی حصہ لے رہے ہیں۔

۞ ۱۳/اگست ۱۹۴۷ء: قتل، آتش زنی اور لوٹ مار۔ بازاروں میں تالے توڑے جا رہے ہیں، دکانیں لٹ رہی ہیں۔ پولیس اور فوج پوری طرح اس میں مدد کر رہی ہے۔ شیطانیت کا بازار گرم ہے۔ شہر میں کوئی حکومت نہیں، نہ کوئی انتظام ہے۔ اس وقت فساد کا رُخ محلوں کی بجائے بازاروں کی طرف زیادہ ہے۔

۞ ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء: مولانا ثناء اللہ امرتسری کے لیے خطوط منگوا لیے گئے۔

مولانا قمر بنارسی کو مولانا کے سامان کے لیے لکھا تھا، تاکہ وہ ''چندوسی'' سے ہندوستانی ہائی کمشنر کو لکھیں۔

۞ ۵ جنوری ۱۹۴۸ء: مولانا ثناء اللہ امرتسری سرگودھا تشریف لے گئے۔ انھیں لاہور تک الوداع کہنے گیا۔ سرگودھا میں پریس الاٹ ہوا ہے۔ بہت علیل اور کمزور ہیں۔

مولانا جعفر پھلواروی اور مولانا رفیق دلاوری صاحب بھی آئے۔

۞ ۷ افروری ۱۹۴۹ء: مولانا محی الدین قصوری تشریف لائے۔

۞ ۲۲ جون ۱۹۴۹ء: مولانا غلام اللہ خان راولپنڈی سے آئے اور مسئلہ توحید پر تقریر فرمائی۔

۞ ۱۴ فروری ۱۹۵۰ء: مولانا محمد طاہر سورتی بن مولانا محمد سورتی تشریف لائے۔

۞ ۱۶/اپریل ۱۹۵۰ء: مولانا غلام اللہ خان کی دعوت پر راولپنڈی میں تقریر۔

۞ ۲۹ ستمبر ۱۹۵۰ء: وزیر آباد میں سیلاب۔ آبائی گاؤں میں اکثر

مکانات گر گئے۔نقد رقم اور خوراک تقسیم کی۔

۵ مئی ۱۹۵۱ء: مولانا فضل الٰہی وزیر آبادی کا انتقال ہو گیا۔ جنازے کے لیے وزیر آباد گیا۔

۱۳ مئی ۱۹۵۱ء: سفرِ سندھ حسب الحکم الشیخ سید بدیع الدین شاہ راشدی صاحب۔

۱۹ دسمبر ۱۹۵۱ء: مولانا نور حسین گرجاکھی نے رات دس بجے انتقال فرمایا۔اسی روز دین محمد خادم نے انتقال فرمایا۔

۹ جنوری ۱۹۵۳ء: آج صبح کراچی پہنچ گئے۔میاں عبدالوہاب کے مکان پر ٹھہرے۔مولانا داود غزنوی نے جمعہ سولجر بازار میں پڑھایا اور میں نے مولوی عبدالستار کی مسجد میں۔

۲۵ جنوری ۱۹۵۴ء: شیخ دین محمد (سابق گورنر سندھ) سے ملاقات ہوئی۔تحقیقات کے بارے میں تبادلۂ خیال ہوا اور مسلمان کی تعریف کے متعلق کافی بحث ہوئی۔ان کا خیال تھا جو مسلمان کہلائے،اسے مسلمان تصور کیا جائے۔

۲۷ جنوری ۱۹۵۴ء: پولیس کو اِطلاع دے کر لاہور کا سفر کیا۔ مولانا داود غزنوی، مولانا عطاء اللہ حنیف، حاجی اسحاق حنیف، خان عبدالغفار خان، شیخ حسام الدین اور مولانا ابوالحسنات قادری سے ملاقات ہوئی۔

۱۴/اپریل ۱۹۵۴ء: ملک سعود کراچی پہنچے۔

۱۵/اپریل ۱۹۵۴ء: ملک سعود سے ملاقات ہوئی۔

۱۵/اپریل ۱۹۵۵ء: آج جامعہ سلفیہ (لائل پور) کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔

۲۰ ستمبر ۱۹۵۵ء: مولانا عبدالشکور شکراوہ سے تشریف لائے۔

۶/اکتوبر ۱۹۵۵ء: لاہور میں سخت سیلاب آیا۔جمعیت نے شاہدرہ کے پاس امدادی کیمپ لگایا۔

دو ماہ کے لیے ضلع کیمبل پور میں میرا داخلہ ممنوع۔

۶ جنوری ۱۹۵۶ء: آج شام شیخ دین محمد صاحب سے ملاقات ہوئی۔ان کی خواہش ہے کہ کشمیر کے متعلق کوئی مثبت کام ہو۔ ایک انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

۱۶ جنوری ۱۹۵۶ء: آج شام استاذِ محترم مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی کا انتقال ہو گیا۔

۲۵ جنوری ۱۹۵۶ء آج صبح کے درس میں قرآنِ مجید ختم ہوا۔غالبًا ۱۶ سال اس میں صرف ہوئے۔کوئی تقریب نہیں ہوئی۔

۲۷ جنوری ۱۹۵۶ء: شہر میں بدامنی اور غنڈہ گردی کے انسداد کے لیے ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں اجلاس ہوا۔انجمن تحفظ مفادِ عامہ کا قیام عمل میں آیا۔مجھے صدر بنایا گیا۔

۱۵ مئی ۱۹۵۶ء: مولانا عبدالجبار کھنڈیلوی تشریف لائے۔

۲۰ جون ۱۹۵۶ء: آج ایک وفد کے ہمراہ ڈی ایف سی (ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر) سے شہر میں غلے کی قلت کے متعلق ملاقات ہوئی۔ انھوں نے خیال کیا کہ اگست کے آخر تک گورنمنٹ آٹا مہیا کر سکے گی۔ان کی گفتگو سے اُمید کے کوئی آثار نمایاں نہیں تھے۔

۲۰ جولائی ۱۹۵۶ء: آج جمعہ کے خطبے میں بابو عبدالحق کے لڑکے نے دور سے اینٹ پھینک دی۔ ٹخنے پر کافی چوٹ آئی۔ بہت زیادہ خون بہہ نکلا،مگر خیر گزری۔عوام کی رپورٹ پر اُسے جیل بھیج دیا گیا۔لوگوں کا خیال ہے کہ اس کا ذہنی توازن درست نہیں۔

۲۶ جولائی ۱۹۵۶ء: فرانس سے آزادیِ الجزائر کے لیے شیخ ابراہیم الجزائری کی قیادت میں ایک وفد آیا۔ڈسٹرکٹ بورڈ کے ہال میں اجلاس ہوا۔شیخ صاحب نے خطاب کیا،صدارت میں نے کی۔مسجد میں چندے کی اپیل کی،کافی رقم جمع ہوئی۔

۱۶ فروری ۱۹۶۴ء: میاں محمود علی قصوری تشریف لائے۔

۱۷ مئی ۱۹۶۴ء: مولانا عبدالعزیز میمن سے لاہور میں ایک کانفرنس میں ملاقات۔

۲۴ مئی ۱۹۶۴ء: ڈپٹی کمشنر کے حکم کی تعمیل کرائی گئی۔دو ماہ کے لیے میرا داخلہ ضلع کیمبل پور میں بند۔